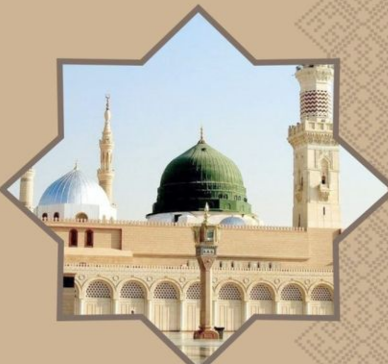
ائمۂ مساجد کے لیے : علمی | فکری | تربیتی | اصلاحی | بیش بہا تحفہ

نَهجُ الأَئِمَّةِ فِي إِصلَاحِ الأُمَّةِ



حصہ چہارم: ائمہ کی ذمے داریوں میں

حصہ پنجم: خطاب ائمہ اوران کا مقام

از : عبدالحفیظ ایلولوی (گجرات)

باسم الفتاح العلیم ۔ وَجَعَلْنَا مِنْھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

ائمہ مساجد کے لیے : علمی | فکری | تربیتی | اصلاحی | بیش بہا تحفہ

نَہجُ الْاَئِمَّۃِ
فِیْ
اِصْلَاحِ الْاُمَّۃِ

حصہ چہارم: ائمہ کی ذمے داریوں میں

حصہ پنجم : خطاب ائمہ اور ان کا مقام

از : عبد الحفیظ ایلولوی (گجرات)

99746 04855

تفصیلات

نام کتاب : نَہجُ الْاَئِمَّۃِ فِیْ اِصْلَاحِ الْاُمَّۃِ

جامع و مرتب : مولانا قاری عبدالحفیظ صاحب ایلولوی

(خادم الحدیث والفقہ جامعہ حسینیہ راندیر، سورت)

پروف ریڈر : جناب حضرت مولانا خالد صاحب

جناب حضرت مفتی ابراہیم صاحب دھولکہ

صفحات : ۱۳۶

سن اشاعت :

اول ایڈیشن :

ناشر: مکتبہ حبان

ایلول نزد نور مسجد

تحصیل: ہمت نگر، ضلع: سابر کانٹھا

گجرات، انڈیا

75750 90455

ناشر: مکتبہ احمدیہ

جامعہ حسینیہ راندیر، مورا بھاگل، راندیر

سورت، گجرات، انڈیا۔

99746 04855

مختصر فہرست (حصہ چہارم)

●	**باب: ائمہ کی مختلف ذمہ داریاں**	۷
●	**فصل اول: امامت کی ذمہ داری**	۷
الف	نماز کے متعلق قابل توجہ خاص امور	۱۱
●	امام کا دل اور زبان سے نیت کرنا	۱۱
●	قراءت اور تکبیرات میں جہر کی مقدار	۱۱
؟؟	امام کو تکبیرات کس طرح کہنی چاہئیں؟	۱۳
●	تکبیر تحریمہ کی صحیح ادائیگی	۱۳
●	قیام کی اصلاح	۱۵
●	رکوع کی اصلاح	۱۵
●	سجدے کی اصلاح	۱۶
؟؟	امام کا رکوع وسجدے میں کتنی بار تسبیح پڑھنا؟	۱۷
←	قومہ وجلسہ اطمینان سے کریں، سنت زندہ کریں	۱۷
ب	مقتدیوں کو چند چیزیں بطور خاص سکھائیں	۲۲
←	وسوسہ اور شک کا ازالہ	۲۲
●	لباس پر نظر اور اس کی درستگی	۲۴
←	مقتدیوں کی تحریمہ میں عام غلطی	۲۵

●	امام نماز سے پہلے مقتدیوں کو متنبہ کرے	۲۵
●	معذورین کی نماز پر توجہ اور اصلاح	۲۷
●	کرسی پر نماز کی اصلاح (حاشیہ)	۲۸
ج	خطبہ ثانیہ کی آخری آیت کی جامعیت	۳۲
●	عقل کے درجات ثلاثہ	۳۵
●	شہوت کے درجات ثلاثہ	۳۵
●	غضب کے درجات ثلاثہ	۳۵
؟؟	خطبہ کی آخری آیت کب سے؟؟	۳۶
●	**فصل دوم: تعلیم کی ذمہ داری**	۳۸
!!	علم الٰہی کی طاقت!!	۳۹
●	مسلمانوں کو مذہبی جہالت سے نکالنا فرض ہے	۴۱
ا	**مسجد میں تعلیمی حلقے**	۴۴
●	مسجد کو تعلیم و تعلّم کے ذریعہ آباد کرنا	۴۴
!!	صحابہؓ کے نزدیک تعلیمی مجالس کی عظمت	۴۷
●	باہمی مذاکرہ	۴۹
●	اہل عجم	۵۱
●	صحابیات و مستورات	۵۲
●	حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس کا ادب	۵۶

ب	تعلیمی حلقوں کے چند امور	۵۸
●	**فصل سوم: تبلیغ کی ذمہ داری**	۶۳
●	ائمہ کرام دین کی دعوت دینے کا اہتمام کریں	۶۵
●	امر بالمعروف ونہی عن المنکر	۶۶
●	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں دعوت الی اللہ کی اہمیت	۶۷
●	پیغمبرانہ دعوت کے چند امتیازی خصائص (مفتی محمد شفیعؒ)	۷۰
۱	امت کی فکر!!!	۷۰
●	قطب بننے کا نسخہ !!!(علامہ شعرانی)	۷۰
۲	دعوت کی لگن !	۷۱
●	دین کی حفاظت کے طریقے (حکیم الامتؒ)	۷۲
●	اندرونی حفاظت کی ضرورت زیادہ ہے	۷۴
●	**فصل چہارم: ایمان واعتقاد کی ذمہ داری**	۷۶
الف	ایمان ویقین	۷۷
(۱)	اسلام کا ایک انقلابی عقیدہ (مفتی محمد شفیعؒ)	۷۹
(۲)	ایمان بالغیب	۸۳
(۳)	ایمان بالقدر	۸۴
(۴)	ایمان بیوم الآخرۃ	۸۷

←	تقویت ایمان کے اسباب	۸۹
ب	نماز نماز نماز	۹۳
(۱)	نماز اور مسائلِ زندگی کا حل	۹۴
(۲)	گناہوں سے نماز کے روکنے کی وضاحت	۹۹
(۳)	نماز بنانے کا ایک طریقہ	۱۰۴
(۴)	مقتدیوں کے خضوع کی ایک تدبیر	۱۰۶
(الف)	عبادت کی حقیقت	۱۰۷
(ب)	بسم اللہ کی برکت وتاثیر	۱۰۸
(ج)	التحیات کیا ہے؟	۱۰۹
●	**فصل پنجم: اتحاد واتفاق کی ذمہ داری**	۱۱۲
!!	ایمان واتحاد کی طاقت !!	۱۱۳
●●	تفرق کے نقصانات	۱۱۵
●	لاحاصل اختلاف	۱۱۸
!!!	جھگڑوں کے نتائج !!!	۱۲۰
؟؟؟	جھگڑیں کس طرح ختم ہوں؟	۱۲۱
●	جھگڑے سے بچنے میں اکابرین کا طرزِ عمل	۱۲۳
←	امت کی پریشانی کا علاج	۱۲۶
⇄	ہر دینی کام کرنے والے کو شریک کار سمجھیں	۱۳۰
←	شخصی جھگڑوں کا علاج	۱۳۱

پیش لفظ

فقیہ عصر جناب حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم

مسجدیں اللہ کا گھر ہیں، اس لیے اللہ کے بھیجے ہوئے دین شریعت سے متعلق تمام کاموں کا مرکز بھی یہی مسجدیں ہیں، نماز باجماعت اور اعتکاف تو ایسا عمل ہے جس کو مسجد ہی میں انجام دینا واجب ہے، لیکن مسجد کا کردار ان دو اعمال تک محدود نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجدیں درسگاہ بھی تھیں، یہیں تزکیہ واحسان کی بزم بھی آراستہ کی جاتی تھیں، اسی میں مسلمانوں کے باہمی مقدمات فیصل کئے جاتے تھے، یہیں سے فتاویٰ صادر کئے جاتے تھے اور مسائل شرعیہ کی رہنمائی ہوتی تھی، یہیں مجاہدین اسلام کے لشکر مرتب کئے جاتے تھے، یہیں سے احکام سلطنت جاری کئے جاتے تھے، اور اسی جگہ بیرونی سفراء اور وفود سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، غرض کے مسجد مسلمانوں کا ہمہ جہت مرکز تھی، اور مسجد کا امام زندگی کے تمام مسائل میں مسلمانوں کا قائد اور رہنما ہوتا تھا۔

افسوس کہ جیسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اضمحلال آ گیا اور مسلمانوں کا عمل قرن اول سے ہٹ گیا، اسی طرح لوگوں نے مسجد کو نماز واعتکاف تک محدود کر دیا، اور ائمہ صرف پانچ وقتہ نماز کے امام سمجھے جانے لگے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ باقی رہا کہ وہ زندگی کے تمام مسائل میں امام کو اپنا قائد ورہنما سمجھیں اور نہ ائمہ میں اپنے درجہ ومرتبہ اور مقام کا احساس باقی رہا کہ وہ صرف نمازوں کے امام نہیں ہیں، بلکہ مسلم معاشرہ کی پوری زندگی کے امام ہیں، آج مسلمان جس

بے دینی، بے راہ روی اور معاملات اور سماجی زندگی میں شریعت سے غفلت کا شکار ہیں، اس کا علاج اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ وہ مسجد کو زندگی کے تمام مسائل میں مرکز ہدایت بنالیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات کو بار بار کہنے اور لکھنے کی ضرورت ہے، مقام مسرت ہے کہ محبی فی اللہ جناب مولانا عبدالحفیظ ایلولوی صاحب نے اس مسئلہ کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرتے ہوئے تفصیل سے قلم اٹھایا ہے، نیز قرآن وحدیث اور سلف صالحین کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے اس موضوع پر ایک مفصل کتاب مرتب کی ہے، جس میں مساجد اور ائمہ مساجد کے مقام اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ائمہ کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ معاشرہ میں مساجد کے کردار کو بحال کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو پوری فعالیت اور بصیرت کے ساتھ انجام دیں، یہ ایک مفید کتاب ہے، مصنف نے مناسب سمجھا کہ تدریج پر عمل کرتے ہوئے اس کے تھوڑے حصے شائع کئے جائیں، اسی لیے ابھی اس کا پہلا حصہ جس میں مساجد کی اہمیت اور منصب امامت کے تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے شائع کر رہے ہیں۔

یہ حقیر ابھی سفر میں ہے، اس نے مختلف مقامات سے مطالعہ کی سعادت حاصل کی، امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب کتاب ہوں گی، موصوف نے نظام مساجد کی اصلاح کا ایک نظام بھی مرتب کیا ہے، اگر واقعی وہ عمل کے سانچہ میں ڈھل جائے تو یہ ایک بڑا کام ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کوشش کو قبول فرمائے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

خالد سیف اللہ رحمانی

نزیل : جامعۃ القرأت، کفلیۃ، گجرات

۷ شعبان ۱۴۳۸ھ

۳ مئی ۲۰۱۷ء

باب : ائمہ کی مختلف ذمہ داریاں

فصل اول : امامت کی ذمہ داری

امام کون ہوتا ہے امام ایسا پیشوا اور ایسا قائد ہوتا ہے جس کی لوگ پیروی کریں، تو پھر یہ کتنا اونچا منصب ہوا !! اس کے لیے کتنی احتیاط کی ضرورت ہے۔اس بارے میں ایک حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں۔

عَن ابی ہریرۃَ رضی اللہُ عنہ قَال قَال رسولُ اللہِ ﷺ الاِمامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ اَللّٰھُمَّ اَرْشِدِ الْاَئِمَّۃَ وَاغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِیْنَ ۔(مشکوٰۃ ۶۵)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ امام ضامن (کفیل) ہے اور مؤذن حضرات امانت دار بنائے گئے ہیں۔اے اللہ ائمہ کو (اپنے مکلفہ امور جاننے اور انہیں بجالا کر بری الذمہ ہونے کی) رشد وہدایت عطا فرما اور مؤذنین کو (ان سے ممکنہ کوتاہیوں میں) معاف فرما۔حضرت ملا علی قاری۔ اَعْلَی اللہُ دَرَجَتَہٗ فِی الْمَلَا الاَعْلَی۔نے بحوالہ قاضی۔قَضَی اللہُ لَہٗ الْجَنَّۃَ وَالفَلَاحَ۔ نقل کیا ہے کہ حدیث گرامی سے یہ ثابت ہوا کہ امام مقتدیوں کی نماز کے امور کا کفیل وضامن ہے اور وہ نماز دعا وغیرہ میں بندوں اور ان کے رب کے درمیان سفیر اور ایلچی ہے،سو مستحبات وسنن کی مکمل رعایت کی وجہ سے جس قدر امام کو مکمل نماز کا ثواب حاصل ہوگا اسی قدر مقتدیوں کو بھی وہ ثواب حاصل ہوگا اور ان کی رعایت ترک کرنے سے جس قدر امام کے ثواب میں کمی ہوگی اسی قدر مقتدیوں کی نمازوں میں بھی کمی ہوگی لیکن اس کا وبال امام پر ہوگا نہ کہ مقتدیوں پر۔کیوں کہ وہ ضامن وکفیل تھا۔خلاصہ یہ کہ مقتدیوں کی نماز کا مدار امام کی نماز پر ہے۔(مرقات ۲/۱۶۵)۔

حضرت مولانا ظفیر الدین رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں کہ امام عالم باعمل اور خدا

ترس ہو اس کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہو، ذرا سی غلطی سے پونجی کے لٹ جانے کا خطرہ ہے! وہ اس دینی عبادت میں اہل مسجد کا امیر ہوتا ہے اور سب کی طرف سے نمائندہ بن کر وہی رب العزت سے مناجات کرتا ہے وہ ایک ایسی مرکزی عبادت کا پیشوا ہے جو افضل العبادات ہے، یہ وہ عہدۂ جلیلہ ہے جسے خودسرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات سے زینت بخشی ہے۔(اسلام کا نظام مساجد ۱۰۸ تا ۱۱۱)۔

اس لیے ائمہ حضرات نماز کو بالکل ٹھیک ٹھیک سنت کے مطابق پڑھائیں۔حتی کہ جہری اور سری قراءت میں بھی تجوید وترتیل کا فرق نہ پڑے کہ جہری میں لوگ سنتے ہیں اس لیے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور سرّی میں جلدی جلدی نہیں بل کہ دونوں میں برابر پڑھیں، اور حروف کی اچھی ادائیگی کے ساتھ قراءت کریں۔

چوں کہ امامت کے مسائل کے متعلق مستقل کتابیں تحریر کی جاچکی ہیں مثلاً مسائل امامت از حضرت **مولانا محمد رفعت قاسمی صاحب** اور اسی نام پر از حضرت **مولانا مفتی غلام رسول منظور قاسمی صاحب** وغیرہ اس لیے ہم مسائل سے متعلق بحث ترک کرتے ہیں آپ ان جامع عمدہ کتابوں کا مطالعہ ضرور فرمائیں اور اپنی امامت کو فضائل ومسائل کی روشنی میں بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

البتہ ہم یہاں کچھ ضروری ہدایتیں اور ضروری مسائل پیش کریں گے جن کی طرف ائمہ حضرات کو خصوصی توجہ کرنی چاہیے۔اور مسائل کے علم کے ساتھ ائمہ فضائل کے علم سے بھی دلچسپی رکھیں کہ ہر ہر عمل کی قیمت مستحضر ہو تو معمولی معمولی آداب کی رعایت بھی آسان ہوگی۔اور معرفت پر مشتمل مضامین بھی مطالعہ میں رکھیں۔جس سے ہر قدم عشق ومحبت میں آگے اٹھے۔ہم جن ضروری باتوں کو پیش کریں گے اس میں تفصیل سے احتراز کریں گے تاکہ طوالت سے بچ سکیں۔

(۱) امام صاحب اگر امامت کے ساتھ کوئی کاروبار یا تجارت کرتے ہیں تو اس پر غور فرمالیں کہ شرعاً خلافِ فتویٰ اور خلافِ تقویٰ تو نہیں کیوں کہ حرام یا شبہ کی غذا کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ ملاعلی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے ''مَنْ یَاکُلُ الحرَامَ لَا یُمَیِّزُ بَیْنَ الْوَسْوَسَۃِ وَالْاِلْھَامِ'' (مرقات ۲/۱۴۲/۱)۔ کہ اسے شیطانی وسوسے اور فرشتے کے الہام میں تمیز نہیں ہوتی۔

(۲) اپنی اہلیہ اور جوان بیٹیاں شرعی پردہ کی محافظ ہوں۔ بالکل بے پردہ نہ ہوں۔

(۳) گھر کا ماحول دینی بنائے رکھیں۔ امام صاحب کے گھر کے ماحول کا اثر آبادی پر پڑتا ہے۔ ان کو خوب حکمت سے سمجھا کر شعائر اسلام کا اور اسلامی وضع قطع کا عادی بنائیں۔

(۴) ائمہ حضرات کے لیے حضرت **مولانا رفعت قاسمی صاحب** نے بڑی ہی عمدہ اور انتہائی اہم ایک بات لکھی ہے کہ امام کے لیے ضروری ہے کہ فتنہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے نہ فتنہ کو تقویت پہنچائے، بل کہ باطل پرستوں کے خلاف اہل حق کی مدد کرے، اللہ کے معاملہ میں کسی برا کہنے والے کے برا کہنے کا خیال نہ کرے، اپنی تعریف کو پسند نہ کرے نہ تو اپنی مذمت کو برا مانے۔ (مسائل امامت ۳۱)۔

(۵) ڈاڑھی، سنت کے مطابق رکھیں، اس کو خواہ مخواہ کسی طرح سے نہ چھیڑیں۔

(۶) لباس، صلحاء کا سا ہو، مصلیٰ امامت پر بددینی کا داغ نہ لگے اس کا پاس ولحاظ رکھیں۔ اور بدبودار لباس سے اپنے کو بچائیں۔

(۷) ٹخنوں سے نیچے پائجامہ یا تہبند حتیٰ کہ کرتا وغیرہ بھی نہ لٹکے اس کا خوب خیال رکھیں، یہ نماز اور خارج نماز دونوں میں حرام ہے۔ لہٰذا پائجامہ سلاتے ہوئے اس کو ٹخنوں سے اوپر کٹوائیں تاکہ بار بار چڑھانے کی دقت پیش نہ آئے۔

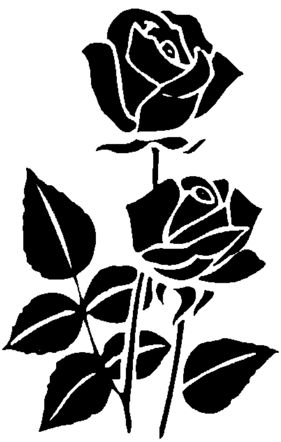
(۸) وقت کا خوب اہتمام کریں۔ اذان ہوتے ہی مسجد جا کر سنن ونوافل، ذکر ودعا اور تلاوت قرآن میں مصروف ہوجائیں۔

(۹) دل کو ہر طرح کی خیانت، حسد کینہ اور بغض سے پاک کرلیں، دل خدا کی تجلی کا ٹھکانہ ہے۔ اور آپ امامت میں خدا اور بندوں کے درمیان سفارت کا کام انجام دینے والے ہیں۔

(۱۰) کسی نماز کے قضا کا تو خیال مشکل ہے تاہم کسی عذر شدید (سفر یا مرض) کی وجہ سے قضا ہو جائے تو اس کی ادائیگی سے پہلے قوم کی کسی نماز میں امامت نہ کریں۔ اس بارے میں مسئلہ کی طرف مراجعت فرمالیں، اور یہی حال قضاوتر کا بھی ہے۔ (مسائل امامت ۱۰۶)۔

(۱۱) غسل اور وضو مسنون طریقہ پر کیا جائے۔ مسائل کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

(۱۲) استنجاء وغیرہ میں پاکی اور صفائی کا بھی خوب اہتمام کیا جائے جس میں ناپاکی کا کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ ورنہ سارے لوگوں کی نماز کا بار قیامت کے روز آپ پر آئے گا جسے آپ اٹھا نہ پائیں گے۔



الف : نماز کے متعلق قابل توجہ خاص امور

(۱) امام کا دل اور زبان سے نیت کرنا :

حضرت مولانا محمد رفعت قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ امام کو چاہیے کہ دل سے نیت کئے بغیر نہ نماز شروع کرے نہ تکبیر تحریمہ کہے۔ اگر زبان سے بھی نیت کرلے تو زیادہ اچھا ہے۔ قلب کی نیت کا ادنی درجہ یہ ہے کہ کسی کے سوال کرنے پر فوراً بتا سکے کہ کیا پڑھنا چاہتا ہے۔ فرض میں اتنی تعیین ضروری ہے کہ ظہر کی یا عصر کی فرض نماز پڑھتا ہوں۔ (مسائل امامت ۳۸، ۱۶۴)۔

(۲) تکبیر میں جہر کی مقدار :

امام کو ''قراءت اور تکبیرات'' کے جہر میں درمیانی طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور قدرے حاجت کے موافق جہر کرنا چاہیے۔ اور یہ فرق اور تفاوت تکبیرات کے درمیان، کہ بعض کو جہر مفرط ادا کرنا اور بعض کو قدرِ حاجت سے بھی کم کردینا مذموم اور بے اصل ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ جیسا بعض ائمہ سے سنا جاتا ہے۔ صرف سلام میں تو فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ دوسرے سلام کو پہلے سلام سے کچھ پست آواز سے کہے اس کے علاوہ اور کسی جگہ جہر میں تفاوت درجات نہیں ہے۔ (مسائل امامت ۱۷۱)۔

(۳) قراءت اور تکبیرات میں جہر کی مقدار :

حضرت مولانا محمد حنیف عبدالمجید دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ امام جہری نماز میں بلا تکلف اس قدر زور سے پڑھے کہ مقتدی قراءت سن سکیں، اس سے زیادہ تکلف کر کے پڑھنا مکروہ و ممنوع ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔'' وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا

وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیلًا '' (بنی اسرائیل ۱۱۰)۔اور نہ تم اپنی نمازوں میں زیادہ زور سے پڑھو اور نہ بالکل آہستہ پڑھو اس کی بیچ والی درمیانی راہ اختیار کرو۔

مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نماز میں درمیانی آواز سے قراءت کرنے سے قلب پر اثر پڑتا ہے اور زور سے پڑھنے سے قاری وسامع دونوں کو تکلیف ہوتی ہے اور اس سے حضور قلب میں خلل واقع ہوتا ہے۔(مسائل امامت ۱۷۱)۔

حضرت مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ نماز میں نہ تو قراءت کو اتنی بلند آواز سے کرو کہ مشرکین سن کر قرآن کو اور قرآن کے اتارنے والے کو اور اس کے لانے والے کو گالیاں دیں، اور نہ اتنا آہستہ پڑھو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب بھی نہ سن سکیں، درمیانی راہ اختیار کرو۔(تحفۃ الائمۃ ۴۶۴)۔

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے اخلاص کی علامت یہ ہے کہ جس طرح فجر میں قراءت کرتا ہے، اسی طرح ظہر میں بھی کرے اور جس طرح عشاء میں کرتا ہے اسی طرح عصر میں کرے۔کیوں کہ دونوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے پڑھ رہا ہے اور دنوں میں مسنون قراءت کی مقدار برابر ہے۔لہٰذا ایسا نہ ہو کر جہری نماز میں تو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے اور سری میں جلدی جلدی۔اسی طرح ایسا بھی نہ ہو کہ جہری میں حد سے زیادہ ٹھہر کر پڑھے کہ جہاں چالیس آیات کی مقدار تک پڑھنا مسنون ہو وہاں دس ہی پڑھی جاسکیں [۱]۔(تحفۃ الائمۃ ۵۰۶)۔

---

[۱] سرّی نمازوں میں سری قراءت اس طرح کرنا کہ ہونٹوں کی حرکت وپھسپھساہٹ ہو ضروری ہے یعنی دل میں قراءت کرنے کا کوئی اعتبار نہیں۔لہٰذا اگر ہونٹوں کی پھسپھساہٹ وحرکت نہ ہوئی تو نماز نہ ہوگی '' ثُمَّ الْمخَافَةُ اَن یُسْمِعَ نَفْسَهٗ ''(ہدایہ ۱/۱۱۷)۔بل کہ مائیک پر کبھی کبھی پھسپھساہٹ مقتدیوں کو محسوس ہوتا کہ وہ سمجھیں کہ امام صاحب قراءت کررہے ہیں۔

(۴) امام کو تکبیرات کس طرح کہنی چاہئیں

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اکثر وبیشتر اماموں کا حال یہ دیکھا گیا کہ نماز پڑھاتے وقت تکبیرات انتقالیہ ''حرکت انتقالیہ'' کے ساتھ نہیں کہتے۔ بل کہ کبھی تو منتقل ہونے کے بعد تکبیر کہتے ہیں اور کبھی دوسرے رکن تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں۔ مثلا رکوع میں جاتے وقت رکوع میں چلے جانے کے بعد ''اللہ اکبر'' کہتے ہیں یا رکوع میں پہنچنے سے پہلے ہی کہنے سے فارغ ہوجاتے ہیں۔ اس طرح سجدے میں جاتے وقت اور سجدے یا قعدہ سے دوسری رکعت کے لیے اٹھتے وقت۔ واضح رہے کہ ان دونوں صورتوں میں تکبیر کی کامل سنت ادا نہیں ہوتی، کامل سنت اس وقت ادا ہوتی ہے جب کہ حرکت انتقالی اور تکبیر انتقالی دونوں ساتھ شروع بھی ہوں اور ساتھ ہی ختم بھی، ورنہ مکروہ ہوگا۔ (فتاوی رحیمیہ ۲۳۳/۱)۔ لہٰذا توجہ سے اس کی مشق کریں اور اس سنت کو زندہ کریں۔

(۵) تکبیر تحریمہ کی صحیح ادائیگی

بعض ائمہ تکبیر کہنے میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہنے کے بجائے ''اَللّٰہُ اَکْبَارِ'' کہتے ہیں یعنی با اور را کے درمیان الف بڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح بعض ائمہ لفظ ''اللہ'' میں بے احتیاطی سے ''آللہ اَکْبَر'' کہتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں بالکل غلط ہیں ان دونوں صورتوں میں نماز فاسد ہوجاتی ہے۔ اور اگر تکبیر تحریمہ میں اس طرح کہہ دیا تو نماز کا شروع کرنا ہی صحیح نہ ہوگا۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ۱۷۶/۲)۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حلیہ وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ تکبیر میں اسم ذات ''اللہ'' اور ''اکبر'' کے الف کو کھینچ کر پڑھنا مفسد صلوٰۃ ہے۔ اور ''لام'' کو اتنا کھینچنا کہ ''الف'' مزید پیدا ہوجائے مکروہ ہے، مفسد نہیں۔ اسی طرح ''ہاء'' کو کھینچنا مکروہ ہے۔۔۔ با کی مد کے مفسد

ہونے میں اختلاف ہے۔۔۔اور''را'' پر پیش کو کھینچ کر پڑھنا مفسد ہے۔

مگر غلبہ جہل کی وجہ سے متاخرین کا فیصلہ یہ ہے کہ اعراب اور مد کی غلطی مفسد نہیں۔ البتہ اگر کوئی تنبیہ کے باوجود اصلاح کی کوشش نہیں کرتا تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اور غلط خواں کو امام بنانا بہرصورت ناجائز ہے۔ بغیر اس مجبوری کے کہ کوئی صحیح پڑھنے والا موجود نہ ہو۔ (احسن الفتاویٰ ۳/ ۴۲۴)۔

نیز بعض ائمہ تکبیر تحریمہ کو اس قدر طویل کردیتے ہیں کہ بعض مقتدی حضرات امام سے پہلے ہی تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھ لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی نماز باطل ہوجاتی ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۳/ ۳۰۵)۔ لہٰذا تکبیر کو طویل نہ کریں۔

(۶) بغیر ثنا قراءت شروع کرنا

ہر کوئی نماز کو ثنا سے شروع کیا جاتا ہے جو مستحب ہے پھر قراءت کی جاتی ہے۔ اگر کوئی ثنا نہ پڑھنے کی عادت بنالے تو یہ مذموم حرکت کہلائے گی۔ لہٰذا نماز جیسی عبادت میں مستحب ترک نہ ہونا چاہیے۔

(۷) دو وقفے

امام کو دوبار وقفہ کرنا چاہیے۔ ایک تو نماز کے شروع میں (ثنا پڑھنے کے لیے)۔ دوسری بار قراءت کے بعد رکوع سے پہلے۔ (مسائل امامت ۳۶)۔ یعنی قراءت کے آخری لفظ کو رکوع کی تکبیر کے ساتھ ملانا نہیں چاہیے۔

(۸) سورۃ فاتحہ کی قراءت

امام کے لیے سنت یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کی ہر آیت پر وقف کرکے پڑھے۔ ایک سانس

میں کئی آیتیں نہ پڑھے یہ طریقہ خلاف سنت ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فاتحہ کی ہر آیت پر وقف کرتے تھے۔عن امِ سلمۃ رضی اللہ عنہا کانَ رسولُ اللہِ ﷺ یَقْطَعُ قِراءتَہٗ یَقولُ ...(مسائل امامت مولانا غلام رسول ۲۲۲)۔

(۹) قیام کی اصلاح

اللہ اکبر کہنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو بغیر گرائے ناف کے نیچے باندھ لیں۔بعض لوگ پہلے دونوں ہاتھ کو اٹھا کر پھر گراتے ہیں پھر باندھتے ہیں یہ صحیح نہیں۔

بہتر یہ ہے کہ دونوں پاؤں قریب قریب ہوں، چار انگل کا فاصلہ ہو، یہ اقرب الی الخشوع ہے۔اس سے سجدے میں دونوں ایڑیوں کو ملانے میں زیادہ حرکت بھی نہیں کرنی پڑے گی۔سجدے میں ایڑیوں کو ملانا ایک علیٰحدہ سنت ہے۔(صحیح ابن خزیمہ ۱/۳۲۸)۔(اعلاء السنن باب طریق السجود ۳/۳۲)(شامی مطلب قراۃ البسملۃ بین الفاتحۃ والسورۃ ۱/۴۹۳)۔نیز قیام کی حالت میں حرکت نہیں کرنی چاہیے،اور جسم کا زور دونوں پاؤں پر برابر ہونا چاہیے۔

(۱۰) رکوع کی اصلاح

رکوع میں انگلیوں سے گھٹنوں کو پکڑے،صرف ہتھیلیوں کو اس پر نہ رکھے۔کیوں کہ پکڑنا بھی سنت ہے(شامی ۱/۴۹۳)۔ ہاتھ اور پاؤں میں خم نہ ہو بل کہ وہ سیدھے اور تنے ہوئے ہوں۔(شامی ۴۹۳)۔رکوع سے اٹھنے کے بعد پیچھے سے دامن کو (کرتے کو) نکالتے ہیں۔یہ دونوں ہاتھوں سے ہو تو بری چیز ہے۔یہ عادت ہونے کی وجہ سے ہو تو اس کے مکروہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں،بل کہ خطرہ اس کا ہے کہ یہ مفسد صلوۃ نہ ہو۔کیوں کہ عمل کثیر پائے جانے کے قریب ہے۔لہٰذا اس سے مکمل اجتناب کی ضرورت ہے۔آج کل یہ خرابی عام ہوگئی ہے۔ہاں صرف ایک دو انگلی کے اشارے سے ہو جائے اور وہ بھی کبھی کبھی تو کوئی مضائقہ نہیں۔

رکوع وسجدہ میں تین مرتبہ ’’سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم ‘‘ اور’’سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی ‘‘ پڑھیں، اس سے کم مکروہ ہے، اس سے زیادہ بہتر ہے۔

(۱۱) تسمیع کو ٹھیک کرنا

بعض ائمہ رکوع سے اٹھتے ہوئے ’’سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ‘‘ کو یا توسَمِیَ اللّٰہُ پڑھتے ہیں یاھُوْلِیمَن پڑھتے ہیں یہ غلط ہے۔ پہلی صورت میں ع، ی سے بدل جاتی ہے اور دوسری صورت میں اللہ کے ہا کا ضمہ واو بن جاتا ہے۔ نیز حمدہ میں میم کے بعد بھی یا ءمدہ نہیں ہے۔’’ حَمِیْدَہٗ‘‘ یہ غلط ہے اصلاح کرلیں۔

(۱۲) سجدے کی اصلاح

قومہ سے سجدہ میں جاتے ہوئے سینہ کو آگے کی طرف جھکائے نہیں کیوں کہ اس سے دوسرے رکوع کی شکل بن جاتی ہے لہٰذا سینہ کو بالکل سیدھا رکھ کر صرف پاؤں کو موڑ کر زمین سے قریب ہو۔ (شامی ۱/۳۳۴)۔ جب تک گھٹنے زمین تک نہ پہنچے تب تک اوپر کے حصے کو حتی الامکان جھکانے سے پرہیز کرے۔

بعض لوگ سجدے میں پاؤں کو اٹھا کر رکھتے ہیں، زمین پر ٹیکتے نہیں، اگر پورا سجدہ اس طرح کیا تو نماز ہی نہیں ہوگی۔ لہٰذا دونوں پاؤں کو زمین پر ٹیک کر رکھیں اور سنت کے مطابق سجدہ کریں، نیز سجدے میں پیر کی انگلیوں کو موڑ کر قبلہ کی طرف متوجہ رکھیں ان کو سیدھا کھڑا نہ رکھیں یہ خلاف سنت ہے۔ اور ان کو ’’قبلہ کے خلاف‘‘ موڑ کر رکھنا جیسا عام لوگ رکھتے ہیں یہ تو بالکل غلط ہے۔ اور سجدے میں جاتے ہوئے دونوں گھٹنوں کو ایک دوسرے سے نزدیک رکھے۔

(ابن خزیمہ ۱/۳۳۸)، اعلاء السنن ۳/۳۲)۔

نیز جماعت کی نماز میں دونوں کہنیوں کو اتنا نہ پھیلائیں کہ دونوں طرف کے نمازیوں

کو تکلیف ہو۔ ہاں اگر تنہا نماز پڑھیں تو سجدے میں کہنیوں کو پھیلائیں نیز تمام احوال میں بازو کو بغل سے دور رکھیں اور رانوں کو پیٹ سے جدا رکھیں اور ہاتھوں کو زمین پر نہ رکھیں بل کہ صرف ہتھیلیوں کو اس پر رکھیں ۔ نیز سجدہ میں ہاتھوں کی انگلیوں کو ملا کر قبلہ کی طرف کریں خصوصًا انگوٹھے کو کہ وہ دائیں بائیں طرف نہ ہو۔

(۱۳) امام کا رکوع وسجدہ میں تسبیح پڑھنا

مستحب یہ ہے کہ امام پانچ بار تسبیح پڑھے، اگر تین بار پڑھے تو اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کہے کہ مقتدیوں کو تین بار پڑھنے کا موقع حاصل ہو جائے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اَسْتَحِبُّ لِلْاِمَامِ اَنْ یُسَبِّحَ خَمْسَ تَسْبِیْحَاتٍ لِکَیْ یُدْرِكَ مَنْ خَلْفَہٗ ثَلَاثَ تَسْبِیْحَاتٍ '' (ترمذی ۳۵/۱)۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ امام پانچ بار تسبیحات پڑھے تا کہ مقتدیوں کو تسبیحات پڑھنے کا موقع مل جائے کیوں کہ امام پانچ بار پڑھے گا تو مقتدی تین بار پڑھ سکیں گے۔

(۱۴) قومہ وجلسہ اطمینان سے کریں اور سنت کو زندہ کریں

قومہ وجلسہ اطمینان سے ادا کئے جائیں جس کو تعدیل کہتے ہیں، عامۃ لوگوں میں تعدیل کے ناتے بڑی کوتاہی پائی جاتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ '' کہتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو جاتے اور اس قدر اطمینان سے کھڑے رہتے کہ ہم کو خیال ہوتا کہ آپ بھول گئے ۔ اور پھر آپ سجدہ کرتے اور دونوں سجدوں کے درمیان اس طرح بیٹھتے کہ ہم کہتے تھے کہ شاید آپ کو وہم تو نہیں ہو گیا۔ (مشکوۃ باب الرکوع ۸۲)۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ کا رکوع ، سجدہ ، دونوں سجدوں

کے درمیان بیٹھنا اور رکوع سے اٹھنا یہ سب تقریباً برابر ہوتا تھا سوائے قیام کے۔ (مشکوٰۃ ۸۲)

رکوع اور سجدہ کی طرح قومہ اور جلسہ میں بھی احناف کے یہاں راجح قول اعتدال کے وجوب کا ہے۔ اگر چہ ایک روایت سنت کی بھی ہے، لیکن حدیثوں کا تقاضا وجوب کا ہے۔ اسی لیے محقق علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے شاگرد ابن امیر الحاج رحمہ اللہ تعالیٰ نے وجوب کو ترجیح دی ہے۔ بل کہ ابن امیر الحاج رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو درست قرار دیا ہے یعنی دوسرا قول صحیح نہیں جیسا فتاویٰ شامی میں ہے۔ ''وَالْقَوْلُ بِوُجوبِ الکُلِّ هُوَ مُخْتَارُ المحقِّقِ ابنِ الهُمّامِ وَتَلْمِيْذِهٖ ابنِ اَمِيْرِ حَاجٍ حَتّٰى قَالَ اِنّه الصّوابُ وَاللهُ الموفِقُ للصوابِ''۔ (شامی ۱/۴۶۴)۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ ''معارف السنن'' میں لکھتے ہیں کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے تعدیل ارکان کی فرضیت جو منقول ہے اس سے مراد عملی فرضیت ہے جیسا کہ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے۔ (کیوں کہ واجب پر بھی عمل ضروری ہوتا ہے)۔ نیز وہ لکھتے ہیں کہ تحقیق یہ ہے کہ ہمارے یہاں بھی اتنی دیر ٹھہرنا کہ حرکت بند ہو جائے فرض ہے۔ پھر ایک تسبیح کی مقدار ٹھہرنا واجب ہے۔ اور تین تسبیح کے بقدر سنت۔ اس طرح ہمارے ائمہ کے درمیان اختلاف ختم ہو جاتا ہے (معارف السنن ۳/۹)۔

لہٰذا ائمہ کرام کو چاہیے کہ تعدیل ارکان کا بہت ہی زیادہ اہتمام فرمائیں اور مقتدیوں کا بھی آہستہ آہستہ ذہن بنائیں کہ وہ بھی رکوع سجدہ اور قومہ وجلسہ کو اطمینان سے ادا کریں۔ اس کا ایک علاج یہ ہے کہ ان کو ان دونوں مقامات پر پڑھنے کے مسنون اذکار سکھادیں جن کا ذکر احادیث مبارکہ میں ہے۔ کیوں کہ نماز نام ہی ہے تسبیح وذکر اور قراءت قرآن کا۔

قومہ وجلسہ کی دعائیں

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے اٹھ کر یہ پڑھتے تھے۔ ''رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمِلْأَ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ'' (ترمذی ۱/۳۶ باب مایقول اذا رفع رأسه عن الرکوع)۔ دوسری روایت میں کچھ الفاظ کا فرق بھی ہے۔ ترجمہ اے اللہ تیرے لیے حمد ہو آسمانوں کو اور زمینوں کو اور ان کے مابین کو بھر کر اور اس کے بعد اس چیز کو بھر کر جس کو تو چاہے۔

حضرت رفاعہ زرقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک روز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے سر اٹھایا تو ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حمده'' کہا اس وقت آپ کے پیچھے ایک شخص (خود) نے یہ کلمات کہے۔ ''رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ'' جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا یہ کلمات کس نے کہے؟ متکلم نے کہا میں نے، آپ نے فرمایا میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا کہ ان کلمات کی طرف بڑھے تا کہ سب سے پہلے ان کو لکھیں۔ (بخاری ۱/۱۱۰)۔ اس حدیث سے تو یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتدی امام کے پیچھے ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' سے زیادہ کلمات بھی کہہ سکتا ہے اور یہ اس صورت میں ہوگا جب امام ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہنے سے زیادہ توقف کرے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھنا ثابت ہے۔'' اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاجْبُرْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ '' (ترمذی ۱/ ۳۸)۔ اے اللہ میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما اور میری شکستگی دور فرما اور مجھے ہدایت عطا فرما اور روزی عطا فرما۔ دوسری روایت میں وَاجْبُرْنِي کی جگہ وَعَافِنِي کا لفظ ہے۔

سوچئے دو سجدوں کے درمیان مختصر وقت میں کتنی اہم دعا مانگی گئی ہے، پانچ مختصر جملوں میں پانچ دعائیں ہیں کاش ہم اس کی اہمیت کو سمجھ لیں۔ اگر ائمہ حضرات اپنے مقتدیوں کو یہ دعائیں سکھائیں تو خود بخود قومہ وجلسہ میں تعدیل کی عادت آجائے گی۔ گویا اس وقت یہ

ایک مردہ سنت کو زندہ کر کے اس کی فضیلت حاصل کرنے کے درجہ میں ہے۔لہٰذا مکتب کے مدرسین کو چاہیے کہ ابھی سے چھوٹے بچوں کو بھی یہ دعائیں سکھایں، کیوں کہ قومہ جلسہ میں روز بروز اس قدر عجلت بڑھتی جارہی ہے کہ امام پر سبقت بھی ہوجاتی ہے اور اس کی وجہ سے منفرد نمازی کے رکوع وسجدہ میں بھی عجلت آرہی ہے۔ اللھم احفظنا من ذلك۔

سلام ودعا

سلام اس طرح پھیرنا چاہیے کہ داہنی طرف سلام پھیر کر پھر چہرہ قبلہ کی طرف متوجہ کریں، پھر یہاں سے بائیں طرف کو پھریں۔ بعض لوگ داہنی طرف سے سلام کی ابتدا کر کے بائیں طرف کو پھیر لیتے ہیں یہ ٹھیک نہیں۔ دونوں طرف سلام پھیرتے ہوئے امام پر اور دونوں طرف کے نمازیوں اور فرشتوں پر سلام کی نیت بھی کرنی چاہیے۔ دعا کے وقت دونوں ہاتھ اتنے اٹھائیں کہ وہ سینے کے برابر ہوجائیں اور دونوں ہاتھوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھیں۔ نہ دونوں کو ملا کر رکھیں، نہ ایک دوسرے پر رکھیں، نہ منھ پر رکھیں۔ (فتاویٰ عالمگیری الباب الرابع ۳۱۸/۵) ۔ماخوذ از نماز کی پابندی اور اس کی حفاظت ۱۹ تا ۲۱)۔

دعا آہستہ کرنا افضل ہے۔ ہمیشہ زور سے دعا کرنا مکروہ ہے ہاں تعلیم کی غرض سے کبھی کبھی زور سے کرلی جائے تو ٹھیک ہے۔ نیز امام خاص اپنے لیے دعا نہ کرے ورنہ خیانت ہوگی احادیث میں اس پر وعیدیں وارد ہیں۔ ہاں جو الفاظ احادیث میں منفرداً وارد ہیں وہ مستثنیٰ ہیں۔

نیز دعا کے بارے میں ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ مسنون کلماتِ دعا۔ ’’اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السّلامُ وَمِنْكَ السّلامُ ... ‘‘میں السلام کے بعد ’’وَاِلَیْكَ یَرْجِعُ السلامُ فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ وَاَدْخِلْنَا دَارَ السّلامِ ‘‘ کا دعا میں اضافہ بے اصل ہے وہ قصہ گو کا گھڑا ہوا ہے۔ ’’فَلَا اَصْلَ لَهُ بَلْ مُخْتَلَقُ بعضِ القصّاصِ۔ (مرقات ۳۵۸/۲)۔

جماعت کے کچھ اہم مسائل :

الف : ائمہ گاہ گاہ مقتدیوں کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے کچھ ضروری مسائل بھی بتایا کریں۔ کیوں کہ بعض لوگوں کو متابعت واقتداء کی نیت کرنا بھی معلوم نہیں ہوتا۔ نیز (بموجب مسلکِ احناف) قراءت خلف الامام کا مسئلہ کہ جب امام کے پیچھے نماز پڑھے تو مقتدی قراءت نہ کرے، نہ جہری نماز میں نہ سری نماز میں، حالاں کہ بعض جاہل مقتدی جہری نمازوں میں امام کے ساتھ قراءت کرنے لگ جاتے ہیں جب کہ امام وہ سورتیں پڑھے جو اس مقتدی کو یاد ہوں۔

ب : مسبوق مقتدی کے مسائل بھی کبھی کبھی بتایا کریں، خصوصًا قراءت کونسی رکعتوں اور کتنی رکعتوں میں کرنا، اسی طرح قعدہ کونسی رکعتوں پر کرنا۔ یہ سب بعضوں کو معلوم نہیں ہوتا۔

ج : کچھ سجدۂ سہو کے مسائل بھی بتانے کے قابل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ بعض مقتدی جہاں اس کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں وہ اس کو بجالاتے ہیں اور جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں چھوڑ دیتے ہیں۔

د : جماعت کی نماز فاسد ہوجائے اس وقت کے کچھ مسائل بھی بتانے کے قابل ہوتے ہیں، مثلاً اگر امام کی نماز (صحت انعقاد کے بعد) فاسد ہوجائے تو وہ واجب الاعادہ ہوتی ہے اب دوبارہ پڑھی جانے والی نماز میں کوئی نیا نمازی جماعت کی نماز میں شریک نہیں ہوسکتا۔ اور اگر انعقاد ہی صحیح نہ ہو تو اب دوبارہ پڑھی جانے والی نماز کی جماعت میں نیا نمازی شریک ہوسکتا ہے۔

ھ : جماعت کی صف میں نماز پڑھنے میں قیام وسجدہ کے مسائل بھی۔

و : جماعت میں مسبوق مقتدی کے شامل ہونے کے مسائل بھی۔ کہ کونسے رکن میں کتنی

دیر شامل ہونے سے رکعت محسوب ہوتی ہے اور کب محسوب نہیں ہوتی وغیرہ۔

ب: مقتدیوں کو چند چیزیں بطور خاص سکھائیں

ائمہ حضرات کو چاہیے کہ مقتدیوں کی نماز درست کرنے کے لیے ذیل کی چیزوں پر خصوصی توجہ فرمائیں اور اپنے اوقات کو فارغ کر کے ایسی حکمت سے ان کی نماز کو درست کریں کہ ان سے فرض بھی ادا ہو اور رب العالمین کی بارگاہ میں قبول بھی۔ احادیث مبارکہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کی اگر نماز سو فی صد ٹھیک بھی ہے لیکن مقتدیوں کی نمازوں کی فکر ان کو نہیں تو یوم قیامت وہ سبکدوش نہیں ہوں گے اس لیے مقتدیوں کی نماز میں کیا کوتاہی ہے اسے جان کر درست فرمادیں۔

(۱) وضو پر توجہ دے کر ٹھیک کرانا

ابوداود شریف کی روایت ہے کہ ایک شخص آیا اور اس نے وضو کیا پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اس نے (دوران وضو) اپنے پیر میں ایک ناخن کی مقدار جگہ خشک چھوڑ دی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا جاؤ اور اچھی طرح وضو کرو۔ (ابوداوٗد ۱/۲۳)۔ لہٰذا ائمہ حضرات گاہِ گاہِ فرداً فرداً مقتدیوں کے وضو پر نظر فرمالیا کریں اور قابل اصلاح چیز کی اصلاح کرلیں تاکہ اس کی نماز عند اللہ مقبول ہو۔

(۲) وسوسہ اور شک کا ازالہ

مقتدیوں میں کچھ افراد وسوسہ اور وہم (مالیخولیا) کے شکار ہوتے ہیں۔ انہیں ہر وقت پائجامہ، کپڑا، بدن اور شرمگاہ کے پاک نہ ہونے ۔۔۔ یا ناپاک ہونے ۔۔۔ اور وضو نہ ہونے ۔۔۔ اور ٹوٹنے کا ۔۔۔ خطرہ، شبہ اور وسوسہ لاحق رہتا ہے۔ جس سے بڑے پریشان رہتے ہیں

اور پانی میں بھی اسراف کرتے ہیں اور وقت بھی ضائع کرتے ہیں۔انہیں بہت ہی حکمت سے ان چیزوں سے نکالیں اگر آپ ان کو نکال سکیں تو واقعی آپ حکمت کے مالک ہیں۔ مذہب اسلام بہت ہی آسان مذہب ہے اس نے اس طرح کے شبہ کا علاج بھی بتایا ہے۔

مختصر یہ کہ آپ یقین اور شک کا فرق سمجھائیں۔یقین کی صورت تو مستثنیٰ ہے کہ اگر ناپاکی کا یا وضو نہ ہونے کا یقین ہو تو وہ الگ بات ہے۔لیکن صرف شک ہو تو یہ سب غیر شرعی عمل ہوگا۔شک دور کرنے کے لیے کہیں کہ نماز آپ کو قبول نہیں کرنا ہے بل کہ اللہ تعالیٰ کو قبول کرنا ہے پیغمبر علیہ السلام نے اس طرح کے وسوسوں سے دور رہنے کی ہدایت دی ہے۔اور اس طرح کے وسوسوں کو خواہ مخواہ پالنے سے روکا ہے۔اور ان کو بتائیں کہ یہ صرف شیطانی وسوسہ ہوتا ہے جس کی خبر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا وضو پر ایک شیطان مسلط ہے جس کا نام ''ولہان'' ہے پس تم پانی کے وسوسے سے بچو۔(مشکوٰۃ ۴۷)۔دیکھیے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمادیا کہ یہ وسوسہ ولہان شیطان ڈالتا ہے جس طرح نماز میں وسوسہ ڈالنے والا شیطان مقرر ہے جس کو خنزب کہتے ہیں۔۔۔کبھی تو یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ کوئی جگہ خشک رہ گئی ہے۔۔۔کبھی یہ کہ میں نے ایک ہی مرتبہ عضو دھویا ہے۔۔۔کبھی یہ کہ پانی ناپاک ہے۔۔۔اور کبھی یہ کہ پیشاب کا قطرہ (یا ریح) نکل گیا ہے۔۔۔لہٰذا اس کا علاج یہ ہے

(۱) اس کی طرف توجہ نہ کی جائے۔سنت کے مطابق وضو کر کے اس پر یقین رکھے اور اپنے سے کہدے کہ بس میرا یہی وضو ہے۔اگر ٹھیک ہے تب بھی اگر ٹھیک نہیں ہے تب بھی ٹھیک ہے، کچھ وقت کے بعد خود بخود وضو و طہارت کا یقین آجائے گا۔

(۲) نفس کو اس طرح سمجھائیں کہ سارے ہی لوگ بل کہ علماء بھی میری طرح خوب کوشش نہیں

کرتے پھر بھی ان کا وضو ہو جاتا ہے تو میرا بھی ہو جانا چاہیے۔ بس شرعی ظاہری اعمال انجام دے کر مطمئین ہو جایا کرے۔

(۳) حدیث شریف میں یہ بھی علاج بتایا گیا ہے کہ استنجاء کے بعد اپنے کپڑوں یا شرمگاہ پر پانی کی چھینٹ دیدے تاکہ پیشاب کے قطرے کا وسوسہ دور ہو جائے۔

(۴) شیطانی وسوسہ سمجھا جائے۔

(۵) نماز پڑھنا ہمارا کام ہے قبول کرنا اللہ کا کام ہے۔

(۶) مذہب اسلام آسان مذہب ہے اس طرح کی سختیوں کا اس میں حکم نہیں ہے۔

(۳) لباس پر نظر اور اس کی درستگی

کچھ مسلمان لباس میں شرعی لباس کی رعایت نہیں کرتے، غیر شرعی لباسوں میں نماز پڑھتے ہیں۔ اگرچہ نماز میں ستر چھپ جاتا ہے لیکن ستر کے چھپنے کے علاوہ بھی چند چیزوں کی رعایت ضروری ہے، لہٰذا ائمہ حضرات حکمت و پیار سے ان کے لباسوں کی اصلاح کریں۔

مثلا جاندار کی تصویروں والا کپڑا نہ ہو، چُست نہ ہو کہ اعضاء کی ساخت نمایاں ہو۔ کرتا یا پاجامہ یا لنگی ٹخنے سے نیچے نہ ہو۔ مردوں کا لباس ریشمی نہ ہو۔ آدھی آستین نہ ہو۔ نیز وضع قطع ٹھیک ہو۔

عامۃً جو لوگ صدری (شرٹ) وغیرہ میں نماز پڑھتے ہیں تو خصوصًا جن کی کمر لمبی ہوتی ہے تو سجدے میں ان کی کمر اور پیٹ (ناف سے نیچے والا حصہ) کھل جاتے ہیں اسی لیے تو وہ بار بار ہاتھ لگا کر کھینچتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر تین بار تسبیح کی مقدار کھلا رہا اور وہ چوتھائی عضو کے برابر کھلا رہا تو نماز ہوگی ہی نہیں۔ (مسائل امامت ۲۱۴)۔ بل کہ پینٹ ڈھیلی ہو اور شرٹ چھوٹا ہو اور جسم موٹا ہو تو سرین کا ابتدائی حصہ بھی نظر آتا ہے، بندے نے خود دیکھا بھی ہے اور اصلاح بھی

اس طرح سے کی کہ الحمدللہ انہوں نے احسان سمجھ کر شکریہ بھی ادا کیا۔

آپ پوری تفصیل حوالے کی کتاب سے دیکھ لیں اس لیے شرٹ والوں کو حکمت سے سمجھادیں کہ یا تو اس میں نماز پڑھے ہی نہیں یا پھر کھلنے سے بچائیں۔ اور بار بار کھینچنا تو نماز کو مکروہ بناہی دے گا بل کہ بعض صورتوں میں عمل کثیر ہو تو مفسد صلوٰۃ بھی ہوگا۔

نیز بغیر ٹوپی، عمامہ یا رومال کھلے سر نماز پڑھنے سے حکمت سے روکیں۔ بندے نے اس میں بھی حکمت سے روکا ہے حتی کہ انہوں نے یہ جملے کہے کہ ہم توبہ کرتے ہیں اور آئندہ کبھی کھلے سر نہیں پڑھیں گے۔

(۴) مقتدیوں کی تحریمہ میں عام غلطی

بعض مرتبہ مقتدیوں میں سے کچھ لوگ امام کے تکبیر تحریمہ ''اللہُ اکبر'' کہنے سے پہلے ''اللہُ اکبر'' کہہ دیتے ہیں یا امام کے لفظ ''اللہ'' ختم ہونے سے پہلے ہی لفظ ''اللہ'' کہہ دیتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں ان مقتدیوں کا نماز شروع کرنا ہی صحیح نہیں ہوتا۔ ان مقتدیوں کو چاہیے کہ وہ پھر سے دوبارہ اللہ اکبر کہہ کر امام کے پیچھے نیت باندھیں۔ (مسائل امامت ۱۷۰)۔

ائمہ کو بالمشافہہ اس کو دیکھنے کا موقع تو غالباً مشکل ہے کیوں کہ وہ خود امام ہیں۔ لیکن بارہا ایسے لوگوں اور علماء کو موقع مل جاتا ہے جو امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں اور مسئلہ کا پورا استحضار ہوتا ہے اور اصلاح کی فکر رکھتے ہیں۔ اس لیے ائمہ حضرات کو چاہیے کہ وہ گاہ گاہ نماز شروع کرنے سے پہلے مقتدیوں کو اس سے باخبر کریں اور سختی سے ان کو روکیں۔ اور ان کو مسنون طریقہ سکھائیں۔

(۵) امام نماز سے پہلے مقتدیوں کو متنبہ کرے

نماز شروع کرنے سے پہلے ائمہ مقتدیوں کو سمجھادیا کریں کہ تم کسی بھی رکن میں مجھ سے

پہل نہ کرنا بل کہ مجھے رکن ادا کرنے دینا پھرتم میری اقتدا کرنا۔اگرتم امام سے پہلے رکن ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرو گے اور اپنی نماز بھی خراب کرو گے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے امام پر پہل کی، یہ دیکھ کر اس سے فرمایا تو نے نہ تو تنہا نماز پڑھی نہ امام کے ساتھ پھر آپ نے اس کو سزا دی اور فرمایا نماز لوٹا دے۔(کتاب الصلوٰۃ للامام احمد ۳)۔

(۶) امام کا صف بندی کرانا

امام کے کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ مصلی پر پہنچتے ہی دائیں بائیں کی صفوں کو درست کرائے، اور اگلی صفوں کو مکمل کرائے۔کیوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذات خود صفوں کو درست اور برابر فرماتے تھے پھر نماز شروع فرماتے۔روایت ہے ''فَاِذَا اسْتَوَیْنَا کَبَّرَ''۔اور اس کا اتنا اہتمام ہوتا تھا روایت میں ہے تیر کو صفوں کی درستگی سے سیدھا کیا جاتا تھا۔یعنی ہر چیز کو تیر سے سیدھا کیا جاتا تھا لیکن صحابہؓ کی صفیں اتنی سیدھی ہوتی تھیں کہ تیر کو بھی صفوں سے سیدھا کیا جاتا تھا اور اتنی سیدھی کہ اگر تیر مارا جائے تو کسی کو نہ لگے۔(مشکوۃ باب تسویۃ الصفوف)۔

(۷) مقتدیوں کو وضو کی طرح نماز بھی سکھانا

حضرت زید بن وہب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے، لیکن رکوع سجدہ پورا نہیں کر رہا ہے۔جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو حضرت حذیفہؓ نے اس سے پوچھا کتنے عرصے سے تم ایسی نماز پڑھ رہے ہو؟ اس نے کہا چالیس سال سے حضرت حذیفہؓ نے فرمایا تم نے چالیس سال سے نماز ٹھیک نہیں پڑھی اور اگر تم ایسی نماز پڑھتے ہوئے مرو گے تو تم اس حالت پر نہیں مرو گے جس پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا کئے گئے تھے۔پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کو نماز سکھانے لگے۔پھر فرمایا آدمی کو چاہیے کہ چاہے وہ نماز میں قیام مختصر کرے لیکن رکوع سجدہ پورا کرے۔(مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۳۲۳)۔

حضرت ابو مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کے والد فرماتے ہیں کہ جب کوئی مسلمان ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسے سب سے پہلے نماز سکھاتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ منبر پر اس طرح التحیات سکھاتے تھے جیسا کہ استاذ مکتب میں بچوں کو سکھاتا ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۳۲۸/۱)۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ نماز اور نماز کے اندر کی چیزیں ایک دوسرے کو سکھانی چاہئیں اس میں شرم و حیا کرنی نہیں چاہیے۔

لہٰذا ائمہ حضرات مقتدیوں کو نماز کے فرائض ۔۔۔ اس کے واجبات ۔۔۔ اس کی سنن ۔۔۔ مستحبات ۔۔۔ فرض قراءت ''سورۃ فاتحہ اور چار سورتیں''۔۔۔ ثنا و دعا۔۔۔ تشہد و درود۔۔۔ رکوع و سجدہ۔۔۔ قیام و قعدہ۔۔۔ تعدیل ارکان ۔۔۔ وغیرہ چیزیں باقاعدہ توجہ سے سکھائیں اور اس کو سرسری نہ سمجھیں کیوں کہ یہ اعمال نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں جس پر براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی ذات صرف کی ہے۔

ہر ہر مقتدی کو گاہ گاہ لے کر بیٹھیں اور سننے کی چیزیں سنیں ۔۔۔ اور دیکھنے کی چیزیں دیکھیں ۔۔۔ اور غلطیوں کی اصلاح کریں۔ حتی کہ آپ کی مسجد میں ان چیزوں کی فکر کا اثر محلہ کے گھروں میں مستورات پر واقع ہو کہ گھروں کی خواتین اپنے اپنے محرموں سے قرآن اور نماز سیکھنے کی طرف متوجہ ہوں اور محلہ کا ہر فرد مرد و عورت، جوان و بوڑھا نماز و قرآن سیکھنے کا جذبہ و احساس حاصل کر لے اور ان کو سیکھنے کے لیے از خود آمادہ ہو۔

(۸) معذورین کی نماز پر توجہ اور اصلاح

جو حضرات معذور ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں چاہے صف میں زمین پر بیٹھ کر یا کرسی وغیرہ پر آپ ان کی نمازوں پر بھی دھیان دیں۔ کیوں کہ بندے نے بہت سوں کو دیکھا ہے کہ ان کے سجدے کا اشارہ رکوع کے اشارہ سے پست نہیں ہوتا نیز سجدے کے اشارے کے وقت ہاتھوں کو رانوں پر رکھنے کے بجائے فضا میں لٹکائے رکھتے ہیں یہ سب

درست نہیں۔ بندے نے ان کو با قاعدہ ان کی طرح نماز پڑھ کر بتایا اور اصلاح کی تو وہ بہت ہی خوش ہوئے [1]۔

---

[1] کرسی پر نماز : عامۃً دیکھا جاتا ہے کہ اچھے خاصے تندرست، چلتے پھیرتے، اٹھتے بیٹھتے لوگ گھروں سے چل کر مسجدوں میں آتے ہی کرسیوں پر نماز پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض حضرات شدید تکالیف کی وجہ سے شریعت کی نظر میں معذور ہوں گے لیکن کیا اتنے سارے لوگ شرعی طور پر معذور ہیں!

فرق: ہم جس تکلیف کو عذر سمجھیں ضروری نہیں کہ وہ شریعت کی نظر میں بھی عذر ہو، دونوں میں فرق بھی ہوسکتا ہے، لہٰذا ہم صرف فکر واحساس دلانے کے لیے مسئلہ کی کچھ وضاحت پیش کرتے ہیں لہٰذا فکر واحساس کے بعد کرسیوں پر نماز پڑھنے والے حضرات، مفتی حضرات سے مسئلہ دریافت کرلیں تاکہ نمازیں درست ہوں۔

الف: قیام فرض ہے اور رکن بھی۔ لہٰذا جو اس پر قادر ہو اسے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا فرض ہے ورنہ نماز ہوگی ہی نہیں۔ اور جو شخص (شدید تکلیف کی وجہ سے) پورے قیام پر قادر نہ بھی ہو تب بھی جو جتنے قیام پر قادر ہو اس پر اتنا قیام فرض ہے مثلاً سورۂ فاتحہ یا ثنا پڑھنے یا کم از کم تکبیر تحریمہ کہنے کے بقدر۔ اگر اس نے اتنا بھی قیام نہ کیا اور (کرسی پر) نماز پڑھ لی تو یہ جائز نہیں خطرہ ہے کہ اس کی نماز جائز نہ ہو (تاتارخانیہ زکریا ۲/۶۶۸) اور (درمختار مع الشامی زکریا ۲/۵۶۷)۔

ب: ہاں اگر قیام پر قادر ہو لیکن رکوع اور سجدے پر قادر نہ ہو تو زمین پر بیٹھ کر اشارے سے نماز ادا کرسکتا ہے (ہدایہ ۱/۱۶۲) بل کہ پھر تو کرسی پر بھی پڑھ سکتا ہے۔ پھر قیام ضروری نہیں۔

ج: جو شخص قیام پر بالکل قادر نہ ہو لیکن زمین پر کسی بھی ہیئت پر بیٹھ کر فرض نماز رکوع وسجدہ کے ساتھ ادا کرسکتا ہو تو اس کو زمین پر بیٹھ کر ہی رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز ادا کرنا ضروری ہے۔ (تاتارخانیہ زکریا ۲/۶۶۷) (کرسی پر بیٹھ کر رکوع وسجدہ کے اشارے سے نماز ادا کرنا جائز نہیں اور اگر کرسی پر پڑھ لی تو نماز نہ ہوگی ہاں اگر رکوع وسجدہ نہ کرسکتا ہوں تو شروع ہی سے بیٹھ کر (کرسی پر یا زمین پر) نماز پڑھ سکتا ہے)۔

خلاصہ یہ کہ شدید تکلیف کا اور معمولی تکلیف کا حکم علیحدہ علیحدہ ہے۔ کونسی تکلیف شدید ہے، کونسی نہیں وہ مفتی حضرات سے معلوم کریں تاکہ آپ کی زندگی بھر کی نمازیں ضائع نہ ہوں۔

تنبیہ: نیز بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کر یا کرسی پر نماز پڑھنے والے صف کے کنارے پر نماز پڑھیں درمیان صف میں نہ پڑھیں، بھدا سا معلوم ہوتا ہے۔

(۹) مقتدیوں کو اہتمام جماعت پر خوب آمادہ کریں

نماز کو مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرنا ایک مستقل بحث کا مقتضی ہے۔اس کے بے شمار فضائل ہیں اور ترک جماعت پر بے شمار وعیدیں بھی ہیں۔ہم بخوف طوالت بیان کرنے سے معذور ہیں حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ کا جامع رسالہ اس بارے میں بہت مفید ہے جس کی تعلیم بھی مسجدوں میں ہوتی ہے۔یہاں دو ایک بات تحریر کردیتے ہیں تاکہ ہم بھی اس کے حصۂ ثواب سے محروم نہ ہوں۔

جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے بارے میں ایک تو وہ طبقہ ہے جو عامۃً اس کا اہتمام رکھتا ہے حتی کہ کاروبار سے نیند سے اور دیگر مشاغل سے بھی نکل کر جماعت کا اہتمام کرتا ہے۔لیکن یہی طبقہ کے افراد جب کسی تقریب وغیرہ میں شامل ہوتے ہیں یا سفر میں ہوتے ہیں یا کوئی ضیافتی وغیرہ پروگراموں میں ہوتے ہیں تو ان پر بھی سستی غالب آجاتی ہے اور جماعت ترک ہوجاتی ہے۔حالاں کہ یہ ان کے حق میں ایک امتحان ہوتا ہے لہٰذا ان کو ان کے درجہ کے لحاظ سے مکمل اہتمام کی ترغیب دیا کریں۔

ان کو بتائیں کہ علماء اصولِ فقہ اپنی کتابوں میں جماعت کی نماز کو ’’ادائے کامل‘‘ اور منفرد کی نماز کو ’’ادائے قاصر‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں اور کامل سے مراد یہ ہے کہ جس طریقہ پر نماز مشروع ہوئی ہے اس طریقہ پر ادا کی جائے اور قاصر یہ ہے کہ مشروع طریقے کے خلاف ادا کی جائے۔(نور الانوار)۔فقہاء امت میں محققین ،جماعت کی نماز کو واجب کہتے ہیں۔علامہ ابن الہمام نے بدائع سے وجوب کا قول نقل کیا ہے اور جن لوگوں نے اس کو لفظ ’’سنت‘‘ سے تعبیر کیا ہے اس کی الگ وجہ بیان کی ہے (فتح القدیر ۱/۳۹ا)۔

(۱۰) نظم جماعت میدان کارزار میں

حضرت مولانا ظفیر الدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہی وجہ تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام بجان ودل جماعت کی نماز پر فدا تھے، جان سے بڑھ کر پیاری کیا چیز ہوسکتی ہے؟ گھمسان کی جنگ ہورہی ہے، گردنیں کٹ کٹ کر گررہی ہیں مگر اس وقت بھی اس دینی شیرازہ بندی کے توڑنے کی اجازت نہیں ملتی بل کہ وہاں بھی حتی الوسع سب ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اپنے والد کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد (عبداللہ) نے فرمایا کہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں شریک تھا، دشمنوں کی ہم سے مڈھ بھیڑ ہوگئی چناں چہ ہم میدان میں نکل پڑے، نماز کا وقت آ گیا تو ہم دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز میں شریک ہوگیا اور دوسرا دشمنوں کے مقابلہ میں ڈٹا رہا، پہلا گروہ جب آپ کے ساتھ ایک رکعت پڑھ چکا تو دوسرا گروہ آپ کے پیچھے نماز کے لیے آ گیا اور پہلا گروہ دشمنوں کے مقابلے میں چلا گیا، جب آپ کی نماز مکمل ہوگئی تو آپ نے سلام پھیر لیا پھر ہر جماعت نے اپنی اپنی بقیہ ایک ایک رکعت پوری کی۔ (بخاری ابواب صلوٰۃ الخوف)۔

میدان جہاد میں بھی شریعت نے جماعت ٹوٹنے نہیں دی بل کہ اس نازک موقع پر خود اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو نازل فرما کر صلوٰۃ الخوف اور اس کا طریقہ تعلیم فرما کر شکست جماعت سے بچالیا۔ جو دلیل ہے اس بات کی خود حق تعالیٰ شانہ کو بھی جماعت کی نماز بہت محبوب ہے۔

بل کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں جو مسجد کی جماعت میں

شریک نہ ہو مسلمان نہ ہونے کا خیال واندیشہ ظاہر فرمایا ہے۔ حضرت بسرا اپنے والد محجن رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اذان ہونے پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز ادا کی جب واپس آ کر دیکھا تو حضرت محجن رضی اللہ عنہ وہیں بیٹھے ہوئے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا تم نے لوگوں کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی، کیا تم مسلمان نہیں ؟ '' اَلَسْتَ بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ '' (مشکوۃ ۱۰۳)۔

اسی طرح حضرت یزید بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث شریف میں ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نماز میں تھے اور میں نماز میں شریک نہ ہوا، جب نماز سے فراغت کے بعد آپ نے مجھے بیٹھا ہوا دیکھا تو فرمایا '' اَلَمْ تُسْلِمْ یَایَزِیْدُ '' اے یزید تم مسلمان نہیں ہو؟ (مشکوۃ ۱۰۳)۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے پوچھا اس شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو تہجد ونوافل پڑھتا ہے مگر جمعہ اور جماعت (کی نماز) میں حاضر نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا '' هُوَ فِي النَّارِ '' وہ درزخی ہے۔ پھر دوسرے دن اس نے آ کر یہی سوال کیا، راوی کا بیان ہے تقریبًا ایک مہینہ برابر اس نے ایسا کیا مگر حضرت عبداللہ بن عباس ؓ ہمیشہ یہی فرماتے رہے کہ وہ دوزخی ہے۔ (اسلام کا نظام مساجد ۴۶)۔

لہٰذا ائمہ کرام حکمت سے مقتدیوں کو جماعت کی نماز پر کھڑا کریں۔ ہر ایک کو اس طرح امادہ کریں کہ جماعت کا خوب ماحول تیار ہوایسا کہ بازاروں کھیتوں اور کارخانوں، حتی کہ گھروں میں خواتین اور سمجھ دار بچے ایک دوسرے کو یاددہانی کرائیں کہ اذان ہو رہی ہے آپ مسجد کو تشریف لے جائیں ورنہ جماعت چھوٹ جائے گی۔

(۱۱) خطبۂ جمعہ ونمازِ جمعہ

عامۃً جمعہ کے خطبات اور جمعہ کی دعا طویل کئے جاتے ہیں اور نماز مختصر۔ حالاں کہ شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ خطبہ مختصر ہو اور نماز اس کے مقابلہ میں طویل ہو۔ کیوں کہ خطبہ بندوں سے متعلق ہے یعنی اس میں امام اور مقتدیوں کی توجہ ایک دوسرے کی طرف ہوتی ہے اور نماز اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے اور اس کے ساتھ مناجات ہے یعنی اس میں توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے ۔(فتاویٰ دارالعلوم ۹۳/۵)۔ اور دعا بھی طویل نہ ہونی چاہیے۔(فتاویٰ دارالعلوم ۱۰۹/۵)۔ اس سے بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس وقت کی اذان بھی ہلکی ہونی چاہیے اسے عام اذانوں کی طرح بہت زیادہ طویل وقفوں سے اور زیادہ دراز کرتے ہوئے نہ دی جائے۔ جمعہ کی مناسبت سے جمعہ کے خطبہ کی آخری آیت شریفہ ''اِنَ اللہَ یا مُرُ بِالْعَدْلِ... کو بھی پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کی جامعیت کا اندازہ ہوجائے۔

ج : خطبۂ ثانیہ کی آخری آیت کا پس منظر اور اس کی جامعیت

آیت شریفہ ''اِنَّ اللہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ''(نحل ۹۰)۔ اللہ تعالیٰ حکم فرماتے ہیں انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا اور منع کرتے ہیں بے حیائی سے اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے اور تم کو سمجھاتے ہیں تاکہ تم یاد رکھو۔ آیت شریفہ میں تین چیزوں کا حکم ہے اور تین چیزوں سے ممانعت ہے۔

● ان میں پہلا عدل وانصاف ہے۔ اب عدل کے ۳ درجات ملاحظہ ہوں۔

الف : پہلا عدل۔۔۔حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ عدل کا مفہوم مختلف نسبتوں سے مختلف ہوجاتا ہے۔ مثلا

انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظ نفس پر اور اس کی رضا کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے اور اس کے احکام کی تعمیل کرے اور اس کے محرمات سے اجتناب کرے۔

ب : دوسرا عدل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کرے وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو۔

ج : تیسرا عدل اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان ہے وہ یہ کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرے اور کسی بھی معاملہ میں خیانت نہ کرے اور کسی انسان کو اپنے کسی قول وفعل سے ظاہرًا وباطنًا کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔۔۔نیز عدل میں عقیدہ کا اعتدال،،،، عمل کا اعتدال،،،اور اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں۔

● دوسرا احسان۔۔۔اس کے لغوی معنی اچھا کرنے کے ہیں۔اس کی دو قسمیں ہیں۔ایک یہ کہ کوئی فعل وعادت کو اپنی ذات میں اچھا کرے اور مکمل کرے۔دوسرے یہ کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ اچھا سلوک اور عمدہ معاملہ کرے۔امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس شخص کے گھر میں اس کی بلی کو اس کی خوراک نہ ملے اور بند پنجرے میں پرندوں کی پوری خبر گیری نہ ہوتی ہو وہ چاہے کتنی ہی عبادت کرے وہ محسنین میں شمار نہ ہوگا۔(قرطبی ، بیروت ۱۰/۱۶۶)۔پھر اپنی ذات میں اچھا کرنا،عبادات، اعمال واخلاق اور معاملات سب کو اچھا کرنا مراد ہے۔

● تیسرا حکم۔۔۔ایتاء ذی القربیٰ رشتہ دار کو دینا۔یہاں تصریح نہیں کہ کیا دینا لیکن دوسری آیت میں ہے ’’اٰتِ ذالقربیٰ حقَّہٗ‘‘ یعنی رشتہ دار کو اس کا حق دو۔اس میں مال دے کر مالی خدمت کرنا، جسمانی خدمت کرنا، بیمار پرسی کرنا، زبانی تسلی وہمدردی کا اظہار کرنا سب ہی شامل

ہیں ۔ یہ تین ایجابی احکام تھے۔ آگے تین ممانعت وحرمت کے احکام ہیں ۔ ''وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ''۔

فحشاء ۔۔۔ ہر ایسے برے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی برائی کھلی ہوئی ہو جس کو ہر شخص برا سمجھے۔ اور منکر ۔۔۔ وہ قول وفعل ہے جس کے حرام وناجائز ہونے پر اہل شرع کا اتفاق ہو۔ اس میں تمام ظاہری، باطنی، عملی اور اخلاقی گناہ داخل ہیں۔ اور بغی ۔۔۔ کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں جس سے ظلم وعدوان مراد ہے ۔ اس آیت میں جو چھ احکام ہیں تین ایجابی اور تین تحریمی اگر غور کیا جائے تو وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مکمل فلاح کا نسخۂ اکسیر ہے۔ رزقنا اللہ اتباعہ۔ (معارف القرآن ۳۸۹/۵)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ ایت شریفہ قرآن شریف کی جامع ترین آیت ہے ۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے شروع میں لوگوں کے کہنے سننے سے شرما شرمی میں اسلام قبول کرلیا تھا حالاں کہ میرے دل میں اسلام راسخ نہیں تھا، یہاں تک کہ ایک روز ۔۔۔ آپ پر یہ آیت نازل ہوئی تو میرے دل میں ایمان مضبوط ومستحکم ہوگیا۔ (معارف القرآن ۳۸۷/۵)۔

حضرت شیخ ابرار احمد دھلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ علماء رحمہم اللہ تعالیٰ نے انسانی صلاحیت کے بارے میں ایک تجزیہ کیا ہے کہ انسان میں تین صلاحیتیں ہیں ۔ ایک صلاحیت ''عقل'' ہے ۔۔۔ (کسی حقیقت کو پرکھنے کے لیے کہ یہ صحیح ہے یا غلط، حق ہے یا باطل، مفید ہے یا مضر؟) سب سے پہلے یہی صلاحیت حرکت میں آتی ہے ۔ اب اگر وہ مفید ونافع ہے تو اس کے حصول کے لیے ایک اور قوت ہے جو قوت ''شہوانیہ'' کہلاتی ہے یہ دوسری صلاحیت ہوئی ۔۔۔ اور اگر وہ مضر ونقصان دہ ہے تو اسے دفاع کے لیے ایک اور قوت دافعہ اللہ تعالیٰ نے

دی ہے جوقوت ’’غضبیہ‘‘ کہلاتی ہے یہ تیسری صلاحیت ہے۔

عقل کے درجاتِ ثلاثہ

پھر خود عقل کے بھی تین درجات ہیں۔ اگر آدمی حد سے زیادہ عقلمند ہے، اس کی ذکاوت قابو سے خارج ہے اور درجہ افراط میں ہے تو یہ شکل ’’جزبرہ‘‘ کہلاتی ہے۔۔۔اگر ضرورت سے بھی کم عقل ہو اور درجہ تفریط میں ہو تو ’’سفاہت‘‘ کہلاتی ہے۔۔۔اور درجہ اعتدال اور مرتبہ ضرورت میں ہو تو اس درجہ کو ’’حکمت‘‘ کہا جاتا ہے۔۔۔عقل کی یہ حالت یعنی حکمت مطلوب حالت ہے۔

شہوت کے درجاتِ ثلاثہ

عقل کی طرح شہوت کے بھی تین درجات ہیں۔ یعنی کسی چیز کے حاصل کرنے اور مزے لینے کی جو خواہش ہے وہ شہوت کہلاتی ہے جس کے تین درجات ہیں۔ اگر غلط جگہ اپنی خواہش کو استعمال کرے اور ضرورت سے زائد خواہشات میں مصروف رہے تو یہ صورت ’’فجور‘‘ کہلاتی ہے۔۔۔اور جہاں ضرورت ہو کہ خواہش پوری کی جائے اس ضرورتی خواہش کی تکمیل پر بھی قادر نہ ہو تو اس کو ’’جمود‘‘ کہتے ہیں۔۔۔اور ان دونون کے درمیان اپنی ضروری خواہش کی تکمیل کرے تو اس اعتدالی صفت کو ’’عفت‘‘ کہتے ہیں۔۔۔جو مطلوب صفت ہے۔

غضب کے درجاتِ ثلاثہ

تیسری قوت، قوت غضبیہ ہے یعنی کسی نقصان دہ اور مضر شی کو دفع کرنے کی قوت۔ اس کے بھی تین درجات ہیں۔ خواہ مخواہ بغیر ضرورت کے اپنے سے دفع کرتے رہنے کو ’’تہور‘‘ کہتے ہیں یعنی غصہ کرنے اور دفع کرنے کی جگہ، ضرورت سے زائد غصہ کرنا اور دفع کرنا تہور ہے

۔۔۔اور ضرورت کی جگہ بھی غصہ نہ آئے اور ضرورت دفع کی ہے پھر بھی دفع نہ کرے تو اس کو ’’جبن‘‘ بزدلی کہتے ہیں ۔۔۔اور درمیانی حالت کو ’’شجاعت‘‘ کہتے ہیں یعنی غصہ کی جگہ غصہ آئے اور نہ آنے کی جگہ نہ آئے وہ شجاعت کہلاتا ہے ۔۔۔ یہ مطلوب صفت ہے ۔ یہ کل نو قسمیں ہوئیں ۔قوت عقلیہ کی تین ،قوت شہوانیہ کی تین ،قوت غضبیہ کی تین ۔

ان نو قسموں میں (یا ان تین اجمالی قسموں میں) جو تین مطلوب حالتیں اور صفتیں یا صلاحیتیں آپ نے ملاحظہ فرمائیں یعنی حکمت ، عفت اور شجاعت کہئے ان تین کا مجموعہ عدالت کہلاتا ہے ۔جس عدالت کا حکم آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ ’’ان اللہ یامر بالعدل‘‘ دیا گیا ہے ۔اس میں تین چیزوں کا حکم ہے ایک عدل ۔دوسری احسان ،تیسری ایتاء ۔ اور تین چیزوں سے ممانعت ہے ایک فحشاء ، دوسری منکر ، تیسری بغی اس سے آیت شریفہ کی جامعیت کا انداز ہو گیا ۔(فیض ابرار ۱۶/۴)۔ (فحشاء و منکر کو نماز کے ’’ گناہوں سے روکنے کی امتیازی تاثیر‘‘ کے بیان میں ملاحظہ فرمائیں)۔جس طرح آیت خطبہ میں ’’فحشاء ،منکر بغی‘‘ کا ذکر ہے اسی طرح آیت نماز ’’اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ ‘‘میں بھی دو چیزوں کا ذکر ہے ۔

خطبہ میں آیت شریفہ کب اور کس کی جانب سے؟

خلیفہ خامس حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانے کے قریب بنوامیہ کے دور میں جمعہ کے خطیبوں نے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کے نام خلفاء راشدین کے ناموں کے ساتھ خطبہ میں شامل کرنا شروع کیا ،اور بآواز بلند ان کے ناموں کو ذکر کر کے ان کو خوش کرنے کی کوشش کرنا شروع کیا تاکہ اپنی فاسد غرض حاصل ہو جس کا اثر یہ ہوا کہ اہل السنۃ والجماعۃ کے خلاف رافضیوں کو علی الاعلان خطبہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف ’’نازیبا کلمات‘‘ کہنے کا

راستہ مل گیا اور انہوں نے بڑی گمراہی کا دروازہ کھول دیا۔

تو حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دور خلافت میں اہل بیت کے خلاف ان ''نازیبا کلمات'' کی بدعت کو ختم بھی کیا جو بنو امیہ کی جانب سے شروع کر رکھی تھی اور خطبہ ثانیہ کے اخیر میں اس جامع آیت شریفہ کو داخل کیا اور تمام خطیبوں کو حکم دیا کہ یہ آیت شریفہ پڑھی جائے جس میں عدل احسان اور قرابت والوں کو دینے کا حکم اور فحش ومنکر اور بغی سے ممانعت ہے، جو ایک بدعت حسنہ ہے بل کہ سنت مستحسنہ ہے۔(مرقات ۳/ ۲۵۳)۔

اللہ تعالیٰ کی شان کہ اس وقت سے لے کر آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے کہ ہر خطیب اس آیت کو پڑھتا ہے اور ان مذکورہ امور ستہ پر توجہ دلاتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں بڑی اچھی باتیں نقل کی گئی ہیں آپ اس کو ضرور پڑھیں [۱]۔

یَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

---

[۱] آیت خطبہ کی تشریح اس لیے کی ہے تا کہ کبھی کبھار جمعہ کے خطاب میں ائمہ حضرات اس آیت شریفہ پر بھی توجہ دلائیں تا کہ اس کی اہمیت واضح ہو اور لوگ اس پر عمل کریں۔

فصل دوم : ’’مقتدیوں کی‘‘ تعلیم کی ذمہ داری

ائمہ حضرات کو چاہیے کہ اپنے ماتحت مقتدیوں کو زیور علم سے آراستہ کریں اور بذریعہ تعلیم انہیں جہالت کے اس دلدل سے نکالیں جو ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔اسی خرابی کی وجہ سے بعثت نبوی سے قبل کے زمانہ کو نہ زمانۂ کفر کہا گیا نہ شرک حالاں کہ کفر وشرک اعظم فسوق اور اکبر ذنوب ہیں بل کہ زمانۂ جہالت کہا گیا کیوں کہ بدعت والحاد حتی کہ خود کفر وشرک کی جڑ اور بنیاد بھی جہالت ہے!!

غالباً یہی وجہ ہے کہ اول وحی ’’ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ‘‘تعلیم پر مشتمل ہے جس میں بذریعہ تعلیم جہالت دور کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ **حضرت مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی** رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس پہلی وحی پر غور کیجئے’’ اِقْرَأْ ‘‘ دو دفعہ ہے یعنی پڑھ اور ’’ عَلَّمَ ‘‘ بھی دو دفعہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے سکھایا اور تعلیم بھی دو طرح کی ہے۔ ایک خطابت وقرأت والی ’’ اِقْرَأْ ‘‘ دوسری قلم وکتابت والی ’’ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ‘‘۔ (مواعظ عبیدیہ ۳۱۶/۲)۔ حضرت مولانا کے ارشاد سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تعلیم کا کیا مقام ہے۔

علم الٰہی کی فضیلت وبرتری

حضرت مولانا عبیداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس علم کی فضیلت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ یہ علم براہ راست خدا کی طرف سے آیا ہے۔اور کس لطافت ونزاکت سے آیا بالکل محفوظ طریقے سے کہ آسمانوں پر جن وشیاطین کی آمد ورفت کا دروازہ بند کر دیا گیا جو اس سے پہلے کھلا تھا۔اور نازل ہوا معصوم ذات پر جو سید الانبیاء وخیر الخلق ﷺ ہے اور لانے والے روح القدس اور روح الامین فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ (مواعظ عبیدیہ ۲۹/۲)۔حضرت مولانا

فرماتے ہیں علم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔جس طرح اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات لامتناہی ہیں اسی طرح علم کی صفت بھی لامتناہی ہے اور وہ تمام صفات پر حاوی ہے۔علم ہی سے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کا پتہ چلتا ہے، جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ اس کے علم ہی سے ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ ایمان بھی جو آیا ہے وہ بھی علم سے آیا ہے!! ارشاد ہے ''فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ'' (محمد ۱۹)۔جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حدیث شریف میں بھی ہے۔''مَن مَاتَ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہ لَا اِلٰہ اِلَّا اللہُ دَخَلَ الْجنۃَ'' ۔اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ باب باندھا ہے ''اَلْاِیْمَانُ قَبلَ الْقَوْلِ''یعنی قول سے پہلے ایمان۔(مواعظ ۱۲/۲)۔

علم الٰہی کی طاقت

حضرت مولانا عبید اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس علم کی طاقت کا اندازہ قرآن شریف کے بیان کردہ بلقیس کے واقعہ سے ہوتا ہے۔حضرت سلیمان علیہ السلام کو اطلاع ملی کی بلقیس اپنے لشکر کے ساتھ (حضرت سلیمان کی دعوت پر ان کے پاس آنے کے لیے) روانہ ہو گئی۔حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اس کا تخت کون جلدی میرے پاس لائے گا؟ تو ایک دیو پیکر جنّ نے کہا میں اس کو آپ کی مجلس کے برخاست ہونے سے پہلے پہلے لا کر حاضر کر دوں گا (جن موتی اور زبرجد کے بہت چور ہوتے ہیں اور خوشبو کے بھی عاشق ہوتے ہیں) لیکن اس جن نے کہا میں اس تخت بلقیس کے اٹھانے کی پوری طاقت بھی رکھتا ہوں اور امانت داری سے بغیر کچھ چرائے آپ کے پاس لا کر رکھ دوں گا۔''اِنِّی لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ''۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اس سے بھی زیادہ پہلے لانا ہے کون لاتا ہے؟ تو کتاب (سلیمان علیہ السلام) کے علم (کے یقین) رکھنے والے آصف بن برخیا نے کہا کہ اس کام کے لیے جنات کی کیا ضرورت ہے؟ میں ہی لاتا ہوں اور آنکھ پلٹنے سے پہلے حاضر کر سکتا ہوں،

چناں چہ ایسا ہی کیا۔ ’’قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ‘‘ (نحل ۴۰)۔تو دیکھئے اتنی بڑی طاقت کا کام حضرت سلیمان علیہ السلام والے علم کے یقین پر ہوا۔دیکھئے ایک تو جن کا علم تھا اور ایک حضرت آصف بن برخیا کا علم ویقین تھا۔(مواعظ عبیدیہ ۴۶/۲)۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ علم کے فضائل اور اس کی طاقت کو پڑھنے سے ہمیں درس عبرت لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنی بڑی دولت دی ہے ہمارے علم کی طاقت کیا ہے۔حضرت نے بڑی تفصیل سے طاقت پر گفتگو کی ہے کہ اس کا اثر چاندوستارہ،سورج اورآسمان وزمین پر واقع ہوتا ہے لیکن جب کہ یقین والا علم ہو اور اگر روٹی والا علم ہے تو پھر اس کی طاقت کا اثر نہ ہوگا۔اور یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ تو کتاب سلیمان علیہ السلام کے علم کی طاقت تھی جب کہ ہمیں تو علم قرآن (جس کا درجہ بہت بلند ہے) عطا کیا گیا ہے پھر اس کی طاقت کس قدر ہوگی!! علم واہل علم کی فضیلت وبرتری اس قدر ہے کہ کوئی اس کا اندازہ نہیں کرسکتا۔جامع بیان العلم اور کفایہ میں روایت نقل کی ہے کہ جو نوجوان اپنی جوانی تا انتہا علمی طلب میں صرف کرے اسے ۴۰ صدیقین کے برابر اجر حاصل ہوتا ہے۔جب ایک صدیق کا حال یہ ہے کہ ان کا درجہ سب سے بڑا تو ان کے اجر کا حال کیا ہوگا!! پھر ۴۰ صدیقین کے اجر کا حال کیا ہوگا!!! یہ روایت ۵۴ پر ملاحظہ ہو۔(مقامی بچے)

حضرت مولانا فرماتے ہیں علم میں یہ طاقت دو چیزوں سے آئے گی۔ایک یقین سے اور دوسرے دعوت سے۔یعنی یہ یقین ہو کہ اسی علم میں کامیابی ہے، چاند پر جانے والے علم میں کامیابی نہیں اسی طرح اس علم کو لے کر بیٹھے رہنے سے بھی اس کی طاقت ظاہر نہ ہوگی بل کہ یہ ظاہر ہوگی اس کی دوسروں کو تعلیم دینے سے اور اس کی دعوت دینے سے۔

یہ علم جب یقین ودعوت کے ساتھ جہاں گیا وہاں اس نے خدائی طاقت کو غالب کیا!! اس نے علم قیصر وکسریٰ کو باطل کیا۔ایک سادھو ایک بزرگ کے پاس آیا یہ حقیقی واقعہ کہہ رہا ہوں

اس نے کہا کہ آپ کے علم کی کیا طاقت ہے؟ میرے علم کی طاقت دیکھو وہ یہ کہہ کر آسمان کی طرف اڑا اور اس نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ تو بزرگ نے اپنا جوتہ آسمان کی طرف پھینکا اور اس کی طرف اشارہ کیا تو جوتہ نے اس سادھو کے سر کو پیٹنا شروع کیا یہاں تک کہ پٹتے پٹتے وہ زمین پر لایا اور ہوش میں آنے کے بعد بزرگ سے معافی مانگی اور کہا مسلمان کا ڈنڈا بھی بڑا اکڑا ہوتا ہے!! (مواعظ عبیدیہ ۲/۴۴)۔

مسلمانوں کو مذہبی جہالت سے نکالنا سب سے بڑا فرض ہے

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانون کو دشمنوں کے معنوی حملوں سے بچانے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ ناقص مسلمانوں کو کامل مسلمان بنایا جائے۔ ایک مسلمان کو، نامسلمان بنانا یہی ہے کہ اس کو عملی اسلام سے آگاہ نہ کیا جائے۔ اگر مسلمانوں کا کوئی طبقہ مذہبی تعلیم سے سراسر جاہل ہے تو وہ بظاہر جو کچھ ہو، عملاً گو یا وہ مسلمان نہیں۔ اس میں اور اس کے ہمسایہ ہندوؤں میں چنداں فرق نہ ہوگا۔ (ہماری ملّی ذمہ داریاں ۱۳)۔

ایک بار **حضرت مولانا محمد الیاس** رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ **حضرت مولانا تھانوی** رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ پس میرا دل یہ چاہتا ہے کہ تعلیم تو ان کی ہو اور طریقہ تبلیغ میرا ہوا کہ اس طرح ان کی تعلیم عام ہوجائے گی۔ پھر فرمایا وعظ میں احکام شرعیہ کی مصالح وعلل بیان نہ کرو۔ بس تین چیزوں کو مدنظر رکھنے کی لوگوں کو تعلیم کی جائے۔

ایک یہ کہ ہر عمل میں رضائے حق کا قصد کریں۔ اور دوسری یہ کہ آخرت کا یقین رکھیں، جو عمل بھی ہو رضائے حق کے لیے ہو اور آخرت کے یقین کے ساتھ ہو کہ یہ آخرت میں مفید ہوگا اور تیسری یہ کہ وہاں اس سے ثواب ملے گا یا عذاب دفع ہوگا۔ اس کے ساتھ کسی ایسے نفع کا قصد نہ

ہو جو موت سے پہلے دنیا میں حاصل ہونے والا ہے۔ وہ تو رونگے کے طور پر خود ہی حاصل ہو جاتے ہیں وہ مقصود نہیں ہیں گویا ان کا حصول یقینی ہے۔ (ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ ۵۸)۔

ایک جگہ فرمایا دنیوی برکات ہمارے لیے موعود ہیں ان کو مقصود و مطلوب نہیں بنانا چاہیے۔ لیکن ان کے لیے دعائیں خوب کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر نعمت کا بندہ بہت زیادہ محتاج ہے۔ ''رَبِّ اِنِّی لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ'' (ملفوظات ۹۷)۔ اور ایک جگہ لکھا ہے۔ ''اِتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا'' دینی کاموں کو بے مقصد یا اطاعت امر الٰہی، ورضائے خداوندی اور ثواب اُخروی کے سوا اور مقاصد کے لیے کرنا بھی دین کو لہو و لعب بنانا ہے۔ (ملفوظات ۱۴۶)۔

ایک علم تو ایمانی ہوتا ہے اور ایک کافرانہ۔ یہود کے علم کے بارے میں فرمایا کہ ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں، یہ علم تو ہے لیکن ہدایت دینے والا نہیں، دلیل ہے جس سے تشفی نہیں، حجت تو ہے لیکن حجت قاطعہ نہیں، نقل ہے سچی نہیں، کلام تو ہے لیکن اس میں حقیقت نہیں بل کہ یہ گمراہی کا ذریعہ ہے۔ اس کے برخلاف ایمانی علم اللہ تعالیٰ کی معرفت سکھاتا ہے، اس سے مقاصد تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اب اس بیماری میں مبتلا ہو چکی ہے، اس کی عبادت تک میں یہ رسمیت آ چکی ہے حتیٰ کہ ''دین کی تعلیم'' بھی جو اس قسم کی ساری خرابیوں کی اصلاح کا ذریعہ ہونی چاہیے تھی وہ بھی بہت سی جگہ ایک ''رسم'' سی ہی بن گئی ہے۔۔۔ علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ اس ضلال اور فساد حال کی اصلاح کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوں اور اس کا ذریعہ ہے تصحیح نیت۔ کیوں کہ اعمال میں ''رسمیت'' جب ہی آتی ہے جب کہ ان میں للّٰہیت اور شان عبدیت نہیں رہتی۔۔۔ (ملفوظات ۱۴)۔

اورفرمایااکثر دینی مدارس میں یہ ایک بڑی غفلت اورکوتاہی ہوتی ہے کہ طلباءکو پڑھاتو دیا جاتا ہےلیکن اس کی کوئی خاص کوشش نہیں کی جاتی کہ اس پڑھنے پڑھانے کا جو اصل مقصد ہے (یعنی خدمت دین اور دعوت الی اللہ) وہ پڑھنے کے بعد اس میں لگیں ۔۔۔(ملفوظات ۱۸)۔

مسجد میں تعلیمی حلقے [1]

(۱) مسجد کو تعلیم و تعلّم کے حلقوں کے ذریعہ آباد کرنا

جیسے ہم نے (حصہ اول کے) مقدمۂ کتاب میں لکھا ہے کہ مساجد اسلام کے روز اول سے رشد و ہدایت کا ذریعہ اور دینی و مذہبی سرگرمیوں کا ٹھکانہ ہیں۔ اگر تاریخ میں اس کے فیض کے عام ہونے پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ قرون اولیٰ میں مساجد فجر سے عشا تک تعلیمی حلقوں سے خوب آباد اور دیگر اعمال دینیہ سے خوب معمور رہتی تھیں۔

جس طرح محلے کا ہر فرد اپنے ذمہ کھانا پینا ضروری سمجھتا تھا اس طرح وہ مسجد سے ان تعلیمی حلقوں میں بیٹھ کر روحانی غذا حاصل کرنا بھی ضروری سمجھتا تھا۔ جس کے نتیجہ میں امت کا ہر فرد پورے دین پر قائم تھا اور گناہوں سے محفوظ۔

تبلیغی اکابرین فرماتے ہیں کہ آج تعلیم کی اہمیت دلوں سے نکل گیی اور تقریر کی اہمیت آ گیی حالاں کہ تعلیم اصل ہے۔ کاش ائمہ حضرات اپنے اسلاف کے اس طرز پر اپنی اپنی مسجد میں تعلیمی حلقوں کو زندہ فرمائیں اور اس کے لیے ایسی ترتیب بنالیں کہ محلہ کا ہر شخص ان میں بیٹھنا شروع کردے اور مساجد شب و روز آباد ہوں جن پر کسی وقت بھی تالا لگنے کی نوبت نہ آئے! جب مساجد اعمال نبویہ اور امور دینیہ سے آباد ہوں گی تو بستیاں اور آبادیاں خوف وخطروں۔۔۔ گناہ ومعاصی۔۔۔ جنگ وجدال۔۔۔ فقر وفاقہ وغیرہ سے محفوظ ہوں گی! اور عفو وایثار۔۔۔ رحمت وبرکت۔۔۔ امن وامان۔۔۔ اخوت وہمدردی کی عام فضا پیدا ہوگی۔

---

[1] یہاں تعلیمی مضامین ''خیر القرون کی درسگاہیں'' کتاب سے ماخوذ ہیں۔

تعلیمی مجلسوں کا انعقاد مسجدوں میں

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''بَابُ ذِکْرِ الْعِلْمِ وَالْفتْیَافِی الْمَسْجِدِ'' اور قاضی ابن الخلاد رامہرمزی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ''اَلْمُحَدِّثُ الْفَاصِلُ بَیْنَ الرَّاوِیْ وَالْوَاعِیْ'' میں ''بَابُ عَقْدُ الْمَجَالِسِ فِی الْمَسَاجِدِ'' قائم کیا ہے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''اَلْفَقِیْہُ وَالْمُتَفَقِّہُ'' میں ''فَضْلُ تَدْرِیْسِ الْفِقْہِ فِی الْمَسَاجِدِ'' کے تحت بہت سے واقعات بیان کئے ہیں۔

ان تینوں کتابوں کے ابواب سے معلوم ہوا کہ مساجد میں تعلیمی حلقے قائم ہوتے تھے۔ عہد نبوی سے مسجدوں میں تعلیمی حلقات ومجالس قائم کی جاتی تھیں، بعد میں اسی سنت کے مطابق علمائے اسلام نے مسجدوں کو تعلیم وتعلم کا مرکز بنایا اور دو تین صدیوں تک مسجدوں میں تعلیم کا یہ سلسلہ جاری رہا جس کے لیے مساجد کے سوا کسی تعمیر کا پتہ نہیں چلتا!

خلیفہ معتضد باللہ متوفی ۲۸۹ھ نے تعلیم کے لیے شاندار عمارت بھی بنائی لیکن فقہاء ومحدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے (اس کی طرف توجہ نہ کی بل کہ) مسجد ہی کو تعلیم کا ٹھکانہ بنائے رکھا۔ چناں چہ اسی غرض سے جامع قرویین اور جامع الاندلس اور جامع ازہر کی بنیاد رکھی گئی۔ بغداد، قاہرہ اور دوسرے اسلامی شہروں میں تیسری اور چوتھی صدی تک مسجدوں میں تعلیمی حلقے قائم ہوتے تھے۔ حتی کہ خطیب بغدادیؒ متوفی ۴۶۳ھ بغداد کی جامع منصور میں اپنی مجلس درس قائم کرتے تھے جس میں سات سو تک فقہاء وعلماء شریک ہوتے تھے۔

موجودہ طرز کے مدارس کی ابتدا چوتھی صدی میں ہوئی اس سے پہلے اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ علامہ مقریزی رحمہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''مدارس اسلام بعد میں بنائے گئے صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ان کا وجود نہیں تھا۔ ان کی تعمیر چوتھی صدی میں ہوئی اور

اہل نیشاپور نے سب سے پہلے ''مدرسہ بیہقیہ'' کی بنیاد ڈالی۔(کتاب الخطط والآثار ۲/۳۶۲)۔

بل کہ عجیب بات یہ ہے کہ مدارس کی تعمیر کے بعد بھی ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی کیوں کہ مساجد میں دینی تعلیم کی افادیت زیادہ تھی، کیوں کہ اس میں ایک تو اتباع سنت تھی۔ دوسری یہ کہ عام مسلمانوں کے لیے بھی مساجد میں علمی و دینی فائدہ تھا۔ علامہ ابن الحاج ''مدخل'' میں لکھتے ہیں ''اَخْذُ الدَّرْسِ فِی الْمَسْجِدِ اَفْضَلُ لِاَجْلِ کَثْرَۃِ الْاِنْفَاعِ بِالْعِلْمِ لِمَنْ قَصَدَہٗ وَمَنْ لَمْ یَقْصُدْہُ، بِخِلَافِ الْمَدْرَسَۃِ فَاِنَّہٗ لَایَأْتِیْ اِلَیْھَا اِلَّامَنْ قَصَدَ الْعِلْمَ اَوِ الْاِسْتِفْتَاءَ .فَاَخْذُہٗ فِی الْمَدْرَسَۃِ اَقَلُّ رُتْبَۃً مِنْہُ فِی الْمَسْجِدِ''۔ اسی لیے یہ سلسلہ چوتھی صدی تک جاری رہا۔

چناں چہ مساجد سے تعلیمی فیض کا یہ سلسلہ ہندوستان تک بھی دراز ہوا کہ ہندوستان کی بعض مساجد سے بھی یہ کام لیا جاتا تھا۔ ان میں جونپور میں ''اٹالہ کی مسجد'' لاہور میں ''وزیر خان کی مسجد'' نئی دہلی میں ''ماہم بیگم'' پرانی دہلی میں ''مسجد فتح پوری'' اور سورت گجرات میں ''مرجان شامی مسجد'' کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے[1]۔ (یاد ایام ۳۶ تا ۳۸)۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد تشریف لائے جہاں صحابہؓ کے جدا جدا حلقے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا بات ہے تم لوگ جدا جدا بیٹھے ہو یعنی تم ایک ساتھ بیٹھو۔ (سنن ابی داؤد کتاب الادب)۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ضعفائے مہاجرین کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا ان میں بعض لوگ بعض کی عریانیت کی وجہ سے آڑ کر کے یعنی مل کر بیٹھے تھے اور ایک قاری ہم کو قرآن شریف پڑھا رہا تھا اسی حال میں رسول اللہ

---

[1] آج بحمداللہ کسی درجہ میں اللہ تعالیٰ نے تبلیغی جدوجہد کو اس سنت کو زندہ ہونے کا ذریعہ بنایا، اور نہ صرف کسی خطۂ خاص کی مساجد کو بل کہ پورے عالم کی مساجد کو اللہ تعالیٰ اس تحریک میں ترقی نصیب فرمائیں۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آ کر ہمارے پاس کھڑے ہو گئے آپ کو دیکھ کر قاری (ادب کی وجہ سے) خاموش ہو گیا آپ نے سلام کر کے پوچھا تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ ہم نے کہا یا رسول اللہ ہم قرآن شریف سیکھتے سکھاتے ہیں آپ نے سن کر فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے جن کے ساتھ مجھے بیٹھنے کا حکم ہے۔ (سنن ابی داؤد کتاب العلم)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ایک شاگرد ایک مرتبہ مسجد نبوی میں گئے اور چاروں طرف نظر ڈال کر فرمانے لگے اس مسجد میں میرا وہ دور گزرا ہے جب وہ باغیچہ کے مانند تھی تم اس کے جس حصہ میں چاہو اور بیٹھ جاؤ (المحدث الفاصل)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے جہاد میں شرکت کی درخواست کی تو انہوں نے فرمایا میں تم کو اس سے اچھی بات نہ بتاؤں؟ تم مسجد بناؤ پھر اس میں فرائض وسنت اور تفقہ فی الدین کی تعلیم دو۔ (جامع بیان العلم ۲۱/۱)۔

حضرت ابوالاحوص رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اہل علم کو دیکھا ہے کہ ان کی مجالس مسجدوں میں منعقد ہوتی تھیں (الفقیہ و المتفقہ ۱۲۹/۲)۔ ابوادریس خولانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بیان ہے ''المساجدُ مجالِسُ الکرامِ'' مسجدیں اعیان واشراف کی مجالس ہیں (حلیۃ الاولیاء ۱۴۱/۵)۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو حکم دیا تھا کہ اپنی مسجدوں میں علم کی نشر واشاعت کریں (اور مسجد میں جو تعلیم کی سنت مٹ رہی ہے اس کو زندہ کریں)۔

صحابہؓ کے نزدیک تعلیمی مجالس کی عظمت واہمیت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک مساجد میں تعلیمی مجالس کا درجہ عبادت کے برابر بل کہ اجر وثواب اور خیر وبرکت کے لحاظ سے اس سے بھی بڑا تھا، اس میں حاضری دینے میں مسابقہ کرتے اور ایک دوسرے کو اس کی یاد دہانی کراتے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

فرماتے ہیں وہ مجلس جس میں، میں خود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھا تھا میرے نزدیک ایک سال کے نیک اعمال سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔" لَمَجۡلِسٌ کُنۡتُ اُجَالِسُہٗ عَبۡدَاللّٰہِ اَوۡثَقُ فِیۡ نَفۡسِیۡ مِنۡ عَمَلٍ سَنَۃٍ " (اعلام الموقعین ۱/۱۴)۔

محمد بن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں کہ میں بصرہ کی مسجد میں گیا جہاں اسود بن سریع رحمہ اللہ تعالیٰ وعظ فرمارہے تھے اور دوسری طرف مسجد میں اہل فقہ کا حلقہ لگا ہوا تھا میں نے دونوں حلقوں کے درمیان نفل نماز پڑھ کر سوچا کہ اگر میں اسودؒ کے وعظ کے حلقہ میں بیٹھتا ہوں تو ان کے ساتھ مجھے بھی رحمت واجابت کا حصہ مل جائے گا، اور اگر اہل فقہ کے حلقہ میں بیٹھتا ہوں تو ہوسکتا ہے کہ میں ان سے کوئی ایسی بات سن لوں جس کو اب تک نہیں سنا تھا اور اس پر عمل کروں،

اسی غور وفکر میں رہا اور کسی میں بھی بیٹھ نہ سکا رات کو خواب میں دیکھا کوئی کہہ رہا ہے تم ہی دونوں حلقوں کے درمیان تھے؟ اگر تم فقہ کے مذاکرے میں بیٹھتے تو ان کے ساتھ جبرئیل کو پاتے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی نے مسجد میں مجالس کے بارے میں پوچھا تو فرمایا یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میراث تقسیم کرنے کے لیے جمع ہیں۔" عَلٰی مِیۡرَاثِ رَسُوۡلِ اللّٰہِ ﷺ یُقَسِّمُوۡنَہٗ " (جامع بیان العلم ۱/۵۱)۔

مجالس کی ہیئت وکیفیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز فجر کے بعد ستون ابو البابہ کے پاس تشریف لاتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس طرح حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے کہ سب کا چہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہوتا تھا، صحابہ کرامؓ کی مجالس اور حلقہ کا طریقہ یہی تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مسجد نبویؐ کی تعمیر وتوسیع میں مختلف ستون لگوائے، اس وقت کی مجالس وحلقوں کا ذکر حضرت عبداللہ بن

مسعود کے ایک شاگرد نے فصیح وبلیغ انداز میں اس طرح کیا ہے ''عَهْدِیْ بِهٰذَا الْمَسْجِدِ وَاَنَّهٗ كَمَثَلِ الرَّوْضَةِ اِخْتَرْ مِنْهَا حَيْثُ شِئْتَ'' (المحدث الفاصل ۱۸۰)۔

ان مجلسوں میں اعیان واشراف، عوام وخواص، مقامی وبیرونی اور عجمی وعربی سب ہی برابر درجہ میں بیٹھتے۔ عجمیوں کے لیے ان کی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا جاتا اور کثرت مجمع پر آواز پہنچانے والا بھی ہوتا، اثناء درس میں اساتذہ وتلامذہ کثرت سے استغفار ودعا کرتے۔ اور ختم مجلس پر اس کی مختلف الفاظ سے وارد شدہ دعا بھی پڑھتے۔ حضرت یزید رُقاشیؒ رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت انسؓ کے بیان کا کچھ حصہ اس طرح نقل کرتے ہیں'' يَقْعُدُ اَحَدُهُمْ فَيَجْتَمِعُوْنَ حَوْلَهٗ فَيَخْطُبُ ، اِنَّمَا كَانُوْا اِذَا صَلُّوْا الْغَدَاةَ قَعَدُوْا حَلْقًا حَلْقًا يَقْرَؤُوْنَ الْقُرْآنَ وَيَتَعَلَّمُوْنَ الْفَرَائِضَ وَالسُّنَنَ'' (مجمع الزوائد ۱/۱۷۵)۔

باہمی مذاکرہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس سے اٹھنے کے بعد آپس میں ان اسباق کا مذاکرہ ومراجعہ کیا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے حدیث بیان فرما کر تشریف لے جاتے تو ہم لوگ آپس میں ان حدیثوں کا مذاکرہ ومراجعہ کرتے اور مذاکرہ کی مجلس سے اس حال میں اٹھتے تھے کہ گویا وہ حدیثیں ہمارے دلوں میں پوری طرح جڑ پکڑ چکی ہوتیں۔ ایک مرتبہ خود اس مذاکرہ کی مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو پوچھنے پر ہم نے بتایا کہ جو کچھ آپ سے سنا ہے اسی کا مذکرہ کر رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا درست ہے تم حدیث یاد کرو اور دوسروں سے بیان کرو۔ (ابوداؤد ۱/۱۶۰)۔

بیرونی بچوں اور نوجوانوں کو تعلیم

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں علم حاصل کرنے مدینہ اور اس کے اطراف کے علاوہ دور دراز سے طلبہ وفود کی صورت میں آتے تھے اور بڑوں کے ساتھ ان کے بچے بھی ضد کر کے شوق سے مدینہ آتے تھے۔ مثلاً وفد تجیب آپ نے ان کو اسلامی روایت کے مطابق ہدایا بھی عطا فرمائیں۔ اس میں ایک کم سن بچے کا ذکر ہے۔ ''وَھُوَ اَحْدَثُنَا سِنًّا''۔ وفد بنی تمیم جس میں ۳۰ لڑکے شامل تھے۔ عمرو بن اہتم کے بارے میں ہے ''اَعْطَاهُ یَوْمَئِذٍ وَھُوَ اَصْغَرُھُمْ خَمْسَ اَوَاقٍ''۔ وفد فزارہ میں حرّ بن حصن تھے جن کے بارے میں ہے ''وَھُوَ اَصْغَرُھُمْ'' (طبقات ابن سعد ۱/۲۹۵)۔ وفد بنی بکّا میں حضرت معاویہ بن ثور سو سالہ عمر کے شخص تھے ان کے ساتھ بشران کا چھوٹا بچہ بھی تھا۔ اس طرح وفد ثقیف وغیرہ بھی۔

سن رسیدہ اور دراز عمر کو تعلیم

درسگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عام طلبہ سن رسیدہ ہوتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے تصریح کی ہے۔ ''وَقَدْ تَعَلَّمَ اَصْحَابُ النَّبِیِّ ﷺ فِیْ کِبَرِ سِنِّھِمْ''۔ (بخاری کتاب العلم)۔ ان میں بعض تو اتنے سن رسیدہ بھی ہوتے تھے جن کے قُوی جواب دے چکے ہوتے تھے آپ ان کی بزرگی کا لحاظ بھی فرماتے اور ان کے مناسب حال تعلیم دیتے۔ اسی طرح قبیصہ بن مخارق کا بیان ہے کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آنے کا سبب دریافت فرمایا تو میں نے کہا ''کَبُرَ سِنِّیْ، وَرَقَّ عَظْمِیْ فَاَتَیْتُكَ لِتُعَلِّمَنِیْ مَا یَنْفَعُنِیْ اللّٰہُ بِہٖ'' پھر آپ نے فرمایا اے قبیصہ اگر تم صبح کو تین بار سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ کہو گے اور جس شجر، حجر اور مدر کے پاس سے گزرو گے وہ سب تمہارے لیے استغفار کریں گے، اور تم اندھے پن، جزام اور فالج سے محفوظ رہو گے۔ (جمع الفوائد ۱/۳۸)۔

ابوریحانہ شمعون رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے آں حضرت ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے قرآن پڑھنے میں مشقت ہوتی ہے تو آپ نے فرمایا تم کثرت سے نماز پڑھا کرو۔ دوسرے شخص نے جب پڑھانے کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے ''ذَوَاتُ الرّاء'' کی تین سورتیں پڑھنے کو کہا اس نے کہا میرا سن زیادہ ہو چکا ہے، دل سخت ہو گیا ہے اور زبان موٹی ہو گئی ہے تو پھر آپ نے ''ذَوَاتِ حٰم'' کی تین سورتیں پڑھنے کو فرمایا اس پر بھی تیار نہ ہوا تو ''ذَوَاتُ السُّبُحَاتِ'' اس پر بھی تیار نہ ہوا تو آپ نے ''اِذَا زُلْزِلَتْ'' پڑھائی پھر آپ نے فرمایا اَفلحَ الرجلُ۔ (ابوداؤد وجمع الفوائد ۱/۱۷۲)۔ غور کیجئے سو سالہ شخص بھی تعلیم حاصل کرتا ہے اور وہ بھی تعلیم کو ضروری سمجھتا ہے۔

اہل عجم

مجلس نبوی ﷺ میں عجمی طلبہ بھی شریک ہوتے تھے۔ عہد رسالت میں فارس، روم، حبش، عراق، عمان، بحرین، یمن، وغیرہ مقامات کے لوگ رہتے اور آپ سے مستفیض ہوتے۔ ان میں اہل فارس کی آپ نے تعریف بھی کی ہے۔ ''اِنَّ اَسْعَدَ الْعَجمِ بِالْاسْلَامِ اَهْلُ فَارِسٍ'' (اُسُدُ الغابۃ فی معرفت الصحابۃ ۳/۵۶)۔ نیز ''لَوْ کَانَ الْعِلْمُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَيَّا لَنَالَهٗ رَجُلٌ مِنْ اَبْنَاءِ فَارِسٍ'' بعض روایت میں علم حاصل کرنے کے بجائے ایمان حاصل کرنے کا ذکر ہے اور ایک شخص کے بجائے بہت سے لوگوں کا ذکر ہے ۔ اہل عجم عربی زبان اچھی طرح نہ سمجھنے میں اور عربی لب ولہجہ میں معذور سمجھے جاتے تھے ''خَرَجَ عَلَيْنَا رَسولُ اللهِ ﷺ وَنَحْنُ نَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ وَفِيْنَا اَعْرَابِيٌّ وَالْعَجَمِيُّ فَقَالَ اِقْرَءُوْا فَكُلٌّ حَسَنٌ ـ'' (جمع الفوائد ۲/۲۸۷)۔

صحابیات ومستورات

صحابیات رضی اللہ عنہن کے لیے بھی ان کے مناسب حال تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا اگر چہ وہ مردوں کے ساتھ حاضر نہیں ہوتی تھیں مگر وہ مختلف طریقوں سے تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ ان کے خصوصی اجتماع میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے جاتے اور تعلیم ووعظ فرمایا کرتے۔ خصوصًا امہات المومنین حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما کے ذریعہ مسائل معلوم کرتیں۔ اور مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر باش صحابہؓ اپنی بیویوں اور عورتوں کو احادیث سناتے اور ان کو سکھاتے۔ سن رسیدہ اور رشتہ دار عورتیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست دینی باتیں معلوم کرتیں۔ اور کبھی اپنا وفد بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجتیں۔

مثلاً حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جو عاقلہ بھی تھی اور دیندار بھی اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مردوں اور عورتوں کی طرف مبعوث کیا، ہم عورتیں آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی اتباع کی، ہم پردہ نشین گھروں میں رہنے والی مردوں کی خواہش کا مرجع، ان کی اولاد کی پرورش کرنے والی ہیں، اور مرد نماز باجماعت، جنازہ اور جہاد میں شرکت کی وجہ سے فضیلت اور ثواب کے مستحق ہوتے ہیں، وہ جب جہاد میں جاتے ہیں تو ہم ان کے مال کی حفاظت اور اولاد کی پروش کرتی ہیں، یا رسول اللہ کیا ہم اس حالت میں اجر وثواب میں مردوں کی شریک ہوسکتی ہیں؟ آگے جواب طویل ہے مختصر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کسی کا اپنے شوہر کے ساتھ حسن سلوک، اس کی مرضی کی جستجو اور اس کے مزاج کے مطابق اتباع ان تمام باتوں کے برابر ہے جن کا ذکر تم نے مردوں کے بارے میں کیا ہے۔ (الاستیعاب ۲/۷۲۶)۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کوئی بھی طبقہ تعلیم سے مستغنی نہیں تھا حتی کہ عورتیں بھی۔

مدینہ منورہ کی درسگاہیں

مدینہ المنورہ کا حال یہ تھا وہاں کے اعیان واشراف اور سرداران قبائل نے برضاو رغبت اسلام قبول کیا تھا، جب کہ مکۃ المکرمہ میں ضعفاء ومساکین نے اسلام قبول کیا تھا، اہل مدینہ نے ہر طرح کی مدد کی بطور خاص قرآن مجید کی تعلیم کا بھی معقول انتظام متعدد مقامات پر کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'' کچھ ملک اور شہر زور وزبردستی سے فتح ہوئے اور مدینہ قرآن کے ذریعہ فتح ہوا'' مَایفتحُ مِن مِصْرٍ اوْ مدینةٍ عَنوةً. فِان المدینةَ فُتحِتْ بالقرآنِ ''۔ (خیر القرون کی درسگاہیں ۲۸)۔

درسگاہ مسجد بنی زُریق۔جس میں حضرت رافع بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ تعلیم دیتے تھے۔ اس کے بارے میں ہے ''اَوَّلُ مَسْجِدٍ قُرِئَ فِیْهِ الْقُرْآنُ بِالْمَدِیْنَةِ مَسْجِدُ بَنِی زُرَیْقٍ ''۔ درسگاہ مسجد قبا جس میں حضرت سالم مولی ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ معلم تھے۔اس بارے میں ہے'' کُنَّا نَتَدَارَسُ الْعِلْمَ فِی مَسْجِدِ قُبَا ۔۔۔'' (جامع بیان العلم ۶/۲)۔ درسگاہ نقیع الخضمات جس میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ معلم تھے۔وہاں کے لوگ جب بیعت ہو کر مکہ المکرمہ سے مدینہ لوٹے تو آپ نے مصعب رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان کو قرآن پڑھائیں اور اسلام کی تعلیم دیں۔'' بَعَثَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَعَهُمْ مُصْعَبَ بْنِ عُمَیْرٍ. وَاَمَرَهُمْ اَنْ یُقْرِءَهُمُ الْقُرْاٰنَ وَیُعَلِّمَهُمُ الْاِسْلَامَ ''۔ (سیرت ابن اہشام ۱/۴۳۴)۔ان کے علاوہ مکہ و مدینہ کے درمیان کی درسگاہ غمیم بھی ہے۔

مسجد نبوی مرکزی درسگاہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری پر مسجد نبوی میں مرکزی درسگاہ کا اجرا ہوا جو مجلس اور حلقہ کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔ (خیر القرون کی درسگاہیں ۴۰)۔اس فصل کے بالکل شروع کی دو حدیثیں عن جابر رضی اللہ عنہ وابی سعید رضی اللہ عنہ اسی مسجد کے بارے میں وارد ہیں۔اس بارے میں بیسیوں حدیثیں

وارد ہیں جن کا احاطہ اس مختصر کے لیے مناسب نہیں۔

درسگاہ نبوی کے طلبہ

حضرت صفوان بن عسال ؓ فرماتے ہیں کہ میں آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں علم کی طلب میں حاضر ہوا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا ''مَرْحَبًا بِطَالِبِ الْعِلْمِ '' طالب علم کو مرحبا ہو، طالب علم کو اس کے طلب علم کی وجہ سے فرشتے گھیرے رہتے ہیں اور اپنے پروں سے اس پر سایہ کئے رہتے ہیں ان کی جماعت نیچے سے اوپر آسمان دنیا تک رہتی ہے۔ (جامع بیان العلم ۳۲/۱)۔آپ کی درسگاہ میں مقامی طلبہ کے علاوہ بیرونی طلبہ بھی کثیر تعداد میں شریک رہتے تھے۔ان ہی میں اصحاب صفہ بھی تھے۔

اصحاب صفہ

مجلس نبوی میں ہر طبقہ کے افراد شریک رہتے تھے، انصار و مہاجرین، مقامی بیرونی، اعیان واشراف، رؤساء قبائل، ملوک واقیال، عالم وجاہل، بدوی شہری عربی عجمی بوڑھے جوان اور بچے سب ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔لیکن ان سب میں اصحاب صفہ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔وہ رات ودن حاضر باش رہتے، ان کی تعداد عام حالات میں ساٹھ ستر کے لگ بھگ ہوتی، علماء نے ان کی مجموعی تعداد چار سو تک بیان کی ہے۔ان کا کام ہر وقت تعلیم وتعلّم تھا۔

مقامی بچے اور نوجوان

رسول اللہ ﷺ بچوں اور نوجوانوں سے بہت زیادہ مانوس تھے، ان کو علم دین کی تاکید کرتے اور اس پر اجر وثواب کی بشارت دیتے تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا ''اَیُّمَا نَاشِئٍ نَشَأَفِیْ طَلَبِ الْعِلْمِ وَالْعِبَادَۃِ حَتّٰی یَکْبُرَ وَھُوَ عَلٰی ذٰلِکَ کَتَبَ اللہُ لَہٗ اَجْرَ اَرْبَعِیْنَ

صِدِّیْقًا''۔ (خیر القرون کی درسگاہیں ۱۵۱ از جامع بیان العلم ۱/۸۲ والکفایہ)۔ جو شخص علمی طلب اور عبادت میں پرورش پاتا ہے یہاں تک کہ اسی حالت میں بڑا ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو چالیس صدیقین کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے'' تمہارے پاس زمین کے اطراف سے نوجوان حدیث کی طلب میں آئیں گے، جب آئیں تو تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا (شرف اصحاب الحدیث ۲۱)۔

ان نوخیز اور نوجوانوں کو ذمہ دارنہ منصب بھی عطا فرمایا تھا۔ معاذ بن جبلؓ کو یمن کا امیر بنایا، عتاب بن سیدؓ کو مکہ کی امارت دی، عثمان بن ابوالعاصؓ کو طائف کی امارت وامامت پر رکھا حالاں کہ یہ حضرات کم سن اور کم عمر تھے۔ ابن عباسؓ کو سینے سے لگا کر دعا دی ''اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ''۔

قرآن پڑھنے سے پہلے ایمان سیکھنا

حضرت جندبؓ فرماتے ہیں'' کُنَّا عَلٰی عَھْدِ النَّبِیِّ ﷺ غِلْمَانًا حَزَاوِرَۃً. تَعَلَّمْنَا الْاِیْمَانَ قَبْلَ اَن نَتَعلَّمَ الْقُرآنَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ فَازْدَدْنَابِہٖ اِیْمَانًا''۔ (تاریخ کبیر ج ا قسم ۱/۲۲۰)۔ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں طاقتور لڑکے تھے ہم نے قرآن پڑھنے سے پہلے ایمان سیکھا، پھر قرآن پڑھا جس کی وجہ سے ہمارا ایمان اور پختہ ہوگیا۔ اس سے دو چیزیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ ایمان کو بھی سیکھنا پڑتا ہے جیسا کہ آج اس کی آواز بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کی جدوجہد میں اہمیت سے لگائی جاتی ہے اور احیاء میں یہ حدیث ہے'' تَعلَّموا الیقین '' کہ ایمان ویقین کو سیکھو۔ (احیاء علوم الدین صفحہ ۷۸) کیوں کہ حدیث کے الفاظ میں یقین ہی ایمان کامل ہے'' الیقینُ الایمانُ کلُّه ''(احیاء ۷۸)۔ دوسری یہ کہ قرآن کی تعلیم سے پہلے ہی ایمان سیکھا جاتا تھا۔

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس کا ادب

محدث ابوالحسین سمعون رحمہ اللہ تعالیٰ نے تحدیث وروایت کی مجلس کی عظمت یوں بیان کی ہے، کہ تم مجلس میں اس طرح رہو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود مجلس میں تشریف فرما ہیں اور گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے حدیث بیان فرمارہے ہیں اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث سن رہے ہیں ''كُنْ كَاَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ جَالِسٌ يُحَدِّثُنَا وَنَسْمَعُ حَدِيْثَه''۔(الکفایۃ ۶۷)۔

جس طرح مسجد نبوی اعمال دینیہ سے آباد تھی، جس میں ہر مسلمان اپنے شعبۂ زندگی کا دین سیکھتا اور سکھاتا تھا، اسی طرح آج بھی ائمہ کرام کی جماعت یہ فیصلہ کرلے کہ ہمیں بھی اپنی اپنی مسجدوں کو اعمال سے آباد کرنا ہے تو آپ یقین رکھیے دنیا میں جو بے دینی کا غلبہ ہے وہ ختم ہوجائے، دینی فضا ہر شعبہ میں غالب ہوجائے۔ کیوں کہ ہر شخص کا تعلق مسجد سے ہوتا ہے۔ مسجد سے تاجر کا۔۔۔کسان کا۔۔۔ڈاکٹر کا۔۔۔انجنیر کا۔۔۔قصاب کا۔۔۔اسکول کے معلم و مہتمم کا۔۔۔موچی کا۔۔۔باورچی کا۔۔حلاق کا۔۔۔مدرسہ کے خادم کا۔۔۔بوڑھے اور جوان کا۔۔۔ ہر ایک کا تعلق ہوتا ہے۔

اگر ائمہ حضرات مقتدیوں کو اس کی ترغیب دیں کہ وہ لوگ صبح اپنے اپنے مشاغل کی طرف جانے سے پہلے ان حلقوں میں بیٹھ کر جائیں اور شام کو لوٹیں تو ان حلقوں میں بیٹھ کر پھر اپنے گھروں کو جائیں تو وہ ایمانی نور کو لے کر لوٹیں گے اور قرآن کریم کی یہ مثال اس پر صادق آئے گی۔ ''وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ'' (انعام ۱۲۲)۔اور ہم نے دی اس کو روشنی جسے لیے پھیرتا ہے اس کو لوگوں میں۔حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نور ایمان صرف کسی مسجد یا خانقاہ یا گوشہ وحجرہ کے ساتھ مخصوص نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ نور دیا ہے وہ اس کو لے کر سب لوگوں کے رزم وبزم میں لیے پھرتا ہے اور ہر جگہ اس روشنی سے خود بھی فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔(معارف القرآن ۳/۴۳۹)۔

حضرت مفتی زین العابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ اگر تم سارے مرد حضرت حسن بصریؒ کی طرح بھی بن جاؤ پھر بھی دین زندہ نہیں ہوگا جب تک عورتوں کے اندر دین زندہ نہ ہو۔ اور عورتیں ساری رابعہ بصریہؒ کی طرح بن جائیں پھر بھی دین زندہ نہیں ہوگا جب تک بچوں میں دین زندہ نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو محنت فرمائی اس سے مردوں میں ابو بکر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، عورتوں میں ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا، بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور غلاموں میں سیدنا بلال رضی اللہ عنہ۔ جب ان چاروں طبقوں میں ہماری طرف سے محنت ہوگی تو دین تمام شعبوں میں زندہ ہوگا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم مساجد کو اس طرح آباد کریں کہ اس کا اثر محلہ کی اسکولوں بازاروں، کھیتوں اور آفسوں تک بھی پہنچے۔

آج ہمارے مسائل یہ ہیں کہ بچے نافرمان ہیں۔۔۔ وقت ضائع کرتے ہیں۔۔۔ بد اخلاق ہیں۔۔۔ جھوٹ بولتے ہیں۔۔۔ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ رہتے ہیں۔۔۔ گھر میں سکون نہیں۔۔۔ ہمسایہ آپس میں ایک دوسرے سے نالاں ہیں۔۔۔ بازار میں خیانت اور جھوٹ ہے۔۔۔ ہمدردی، تعاون کی کوئی چیز نہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان مشکلات کے جراثیم خود ہمارے اپنے گھروں کے ماحول سے اور مساجد کو آباد نہ کرنے سے پیدا ہوئے ہیں، اس کا علاج یہی ہے کہ مساجد کو آباد کریں اور اپنے گھروں اور محلوں کی فضا کو تبدیل کریں پھر سب طرف امن و ہمدردی کی فضا قائم ہوگی، اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں پر پختگی سے عمل کی توفیق عطا فرمائیں آمین [1]۔

---

[1] الحمد اللہ آج تبلیغی جدو جہد سے کسی درجہ میں مساجد آباد ہونے جارہی ہیں، جماعتیں اپنے وطن سے نکل کر ۲۴ گھنٹے مساجد میں ٹھہر کر تعلیم کے حلقوں دعاء ذکر، گشتوں اور دینی مذاکروں سے ان کو آباد کرتی ہیں، بل کہ خود اپنے مقام پر رہتے ہوئے بھی مقامی پانچ کاموں سے خصوصًا ڈھائی گھنٹہ سے مساجد کو آباد کرنے کی فکر و کوشش کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھرپور مدد فرمائیں۔

(۲) مسجد میں تعلیمی حلقوں کے چند امور

مذکورہ بالا بحثوں سے یہ تو معلوم ہو ہی گیا کہ مسجد میں تعلیمی حلقوں میں کیا کیا سیکھنا اور دوسروں کو کیا سکھانا تاہم سہولت کے خاطر چند چیزوں کو یکجا طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) قرآن شریف سیکھنا سکھانا : سیکھے ہوئے لوگ دوسروں کو قرآن شریف سکھائیں۔ جس میں جانبین سے پڑھنا پڑھانا اور سننا سنانا ہو۔ جو لوگ فرض مقدار آموختہ جانتے ہیں لیکن ناظرہ نہیں جانتے تو پہلے ان کے آموختہ کی تصحیح کرائی جائے تاکہ فساد صلوٰۃ کا شبہ نہ رہے، پھر ناظرہ سکھایا جائے چاہیے بہت دھیرے دھیرے ہو۔ اور جو ناظرہ خواہ ہیں ان کی صحت وتجوید کی فکر کی جائے۔ اور ساتھ ہی بعض سورتیں جن کے فضائل ہیں آموختہ کرائی جائیں۔

(۲) غسل ووضو کے فرائض سکھائیں : پھر نماز کے فرائض وواجبات ۔۔۔ وضو ونماز کی سنتیں اور ان کے آداب ۔۔۔ پھر وضو وغسل کی سنتیں ۔۔۔ پھر نواقض وضو ۔۔۔ پھر خاص مفسدات صلوٰۃ جن سے زیادہ تر فساد کا اندیشہ رہتا ہے۔

(۳) کچھ خاص کتابوں سے اسلام کے موٹے موٹے وہ عقائد سکھائیں جن میں مذہبی کوئی اختلاف نہ ہو۔ جیسے **حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب** رحمہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم الاسلام اور **حضرت مولانا سید احمد علیؒ** کی بہشتی زیور وغیرہ (ملفوظات حکیم الامت ۱۱/ ۱۸۲)۔

(۴) موقع ومحل کے ضروری مسائل سکھائیں مثلا رمضان شریف میں روزے کے ۔۔۔ قربانی کے دنوں میں قربانی کے ۔۔۔ جمعہ وعیدین کے مسائل اور ان کی سنتیں اور طریقے ۔۔۔ زکات کے ۔۔۔ ایام حج سے پہلے حج کے ۔۔۔ عقیقہ، ولیمہ اور نکاح کے مسائل وسنتیں ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

(۵) امور معاملات ومعاشرت : ائمہ حضرات مقتدیوں کو معاملات ومعاشرت کا

دین اوران کے مسائل بھی سمجھایا کریں اس لیے کہ اسلام میں ان کا بڑا مقام ومرتبہ ہے۔جس کے بغیر کوئی صحیح معنی میں کامل مومن ومسلم نہیں بن سکتا، ورنہ ہوگا یہ کہ آدمی عبادت کے راستے سے اللہ کے قریب ہوگا اور معاملات ومعاشرت کے راستے سے دور ہوجائے گا۔آج کل اس کا کوئی خاص اہتمام ہی نہیں کہ ہماری معاشرت اور معاملات شرعی ہدایات کے موافق ہیں یا نہیں۔

بسا اوقات لوگ اپنی روزی کے چکر میں خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں اسے پوچھنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے اور تھوڑے سے نفع کے خاطر معاملہ طے کر لیتے ہیں۔حالاں کہ بعض لوگ اپنے ایمانی شعور کی وجہ سے اس پر آمادہ ہوتے ہیں کہ اگر معلوم ہوجائے کہ یہ معاملہ حرام ہے تو اسے چھوڑ دیں لیکن ہر ہر معاملہ کو پوچھنے کی طرف توجہ نہیں کر پاتے۔ان کو بتانے سے فائدہ یہ ہوگا کہ پھر وہ ہر ہر مسئلہ میں پوچھنے کی طرف متوجہ ہوں گے اور بالآخر وہ حرام سے بچنے والے بنیں گے۔اور جن کو حرام کی بالکل فکر ہی نہیں تھی ان میں اس کی فکر آنی شروع ہوگی۔

ایک تدبیر :

اس بارے میں اگر ائمہ حضرات مختلف طبقات کے لوگوں کو جوڑ کر انہیں پوری معاشرت اور معاملات کی راہنمائی کریں تو سونے پر سہاگہ۔کبھی تاجروں کا، کبھی ملازمین کا، کبھی کسانوں کا اور کبھی مزدوروں کا جوڑ وغیرہ، انہیں جمع کر کے صحیح صحیح راہ نمائی کی جائے۔اگر ائمہ حضرات از خود انجام نہ دے سکیں تو قابل بڑے علماء کو بلا کر اور قوم ومعاشرے کے بڑے حضرات کا تعاون لے کر انجام دلائیں۔اگر ایسا بھی کیا تو سمجھیے آپ نے بہت بڑا کام کیا۔

اسی طرح مقتدیوں کو عاریت (صرف استعمال کے لیے چیز لینے) کا دین اور اس کے مسائل بھی سمجھانے کی ضرورت ہے۔

کیوں کہ عامۃً مکانات کے پڑوسیوں، دکاندار پڑوسیوں، کھیت ریل سفر کے پڑوسیوں اور ملازمین پڑوسیوں میں ضرورت پڑنے پر کچھ چیزیں صرف استعمال کے لیے (عاریت) مانگ کر لیجاتی ہیں (پھر واپس کرنی ہوتی ہیں) لیکن اس کے احکام سے واقفیت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ کام خلاف شرع خلاف دین بن جاتا ہے۔ جب کہ پڑوسیوں کے حقوق کس قدر ہیں وہ ہر شخص جانتا ہے۔ اسی طرح امانت وغیرہ کے مسائل۔

(٦) مختلف اعمال وعبادات کے فضائل بار بار سنائے جائیں جس سے عمل کی طرف رغبت بڑھے۔ جن مساجد میں تبلیغی جدوجہد جاری ہے وہاں فضائل اعمال (**شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا** رحمہ اللہ تعالیٰ) کی تعلیم میں مقتدیوں کو شرکت کرائیں، اور اگر تبلیغی حلقے قائم نہ ہوں تو ائمہ حضرات منتظمین اور نمازیوں کا حکمت سے دھیرے دھیرے ذہن بنا کر ان کو قائم کریں۔ ان شاء اللہ دینی فضا میں بہت ترقی ہوگی۔ **حضرت مولانا محمد الیاس** رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ فضائل کا درجہ مسائل سے پہلے ہے، فضائل سے اعمال کے اجر پر یقین ہوتا ہے جو ایمان کا مقام ہے اور اسی (یقین) سے آدمی عمل کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ مسائل معلوم کرنے کی ضرورت کا احساس تو تب ہی ہوگا جب وہ عمل پر تیار ہوگا اس لیے ہمارے نزدیک فضائل کی اہمیت زیادہ ہے۔ (ملفوظات ١٦٤)۔

(٧) روزمرہ کے کاموں کی دعائیں ایک ایک کر کے سکھائیں تا کہ ان کو پڑھا کریں اور ان کاموں کے سنت طریقے سمجھا دیں، تا کہ ان کے مطابق کاموں کو انجام دیا کریں۔ اس سے اتباع سنت اور دین پر چلنے کا جذبہ لوگوں میں پیدا ہوگا۔ مثلاً ''کھانے پینے، اٹھنے سونے، بیت الخلاء میں داخل ہونے اور نکلنے، مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے، گھر سے نکلنے اور داخل ہونے، کپڑے پہننے، صبح وشام میں پڑھنے وغیرہ کی دعائیں۔ دل چاہ رہا ہے کہ کچھ دعائیں

لکھی جائیں جو بہت ہی اہم ہیں لیکن طوالت کا خوف ہے خود ائمہ حضرات اہم دعاؤں کا انتخاب کر کے مقتدیوں کو سکھائیں۔

(۸) کچھ وقت ان حلقوں میں ٦ صفات کے مذکروں کے لیے بھی طے کریں۔

جس سے یقیناً غیر شعوری طور پر دینی احساس پیدا ہوگا، اور یہ پوری دنیا پر آزمایہ ہوا اکسیر نسخہ ہے اور بہت ہی مفید علاج ہے، کیوں کہ اس پر جان و مال لگ کر ایمان میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔

چھ صفات کیوں ؟

بعض حضرات کو یہ سوال رہتا ہے کہ ارکان تو پانچ ہیں چھ کہاں سے آئے؟ تو حضرت **مولانا عبید اللہ صاحب** رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ارکان خمسہ میں سے دو ارکان (کلمہ اور نماز) لیے ہیں، جب روزہ کا زمانہ آئے گا تو روزہ بھی لیں گے۔ اور زمانۂ حج میں حج لیں گے۔ تو چار ہو گئے اور جب مالدار ملے گا تو اس سے زکات کی بات کریں گے تو پانچ ہو گئے لیکن تین رکنوں کو بعد میں رکھتے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ اور نماز کو پہلے نازل کیا اور زکات، روزہ اور حج کو بعد میں اتارا، لہٰذا بعد میں رکھنے کا یہ مطلب نہیں ان کو لیا ہی نہیں کیوں کہ ہر جگہ زکات بولنے میں کوئی فائدہ نہیں، فقیر کے سامنے زکات بول کر فقیر کیا کرے گا؟

تو ارکان میں سے دو لیے کلمہ اور نماز جو روزانہ کا ۲۴ گھنٹہ کا ہر موقع کا ہر سال کا ہر جگہ کا کام ہے۔ اور علم و ذکر یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے غرض ہیں اور کلمہ نماز کو ٹھیک کرنے کے لیے شرط اور سبب ہے تو اسباب میں سے یہ دو سبب لیے ان دونوں کو ملا کر ایک بنا دیا ہے۔ اور اکرام و اخلاص ان کے قبول ہونے کی شرطوں میں سے ہیں تو پانچ ہو گئے اور علم کو عام کرنے کے لیے تفریغ وقت لیا۔ (مواعظ عبیدیہ ۲/ ۱۰۴)۔

زکات کے بارے میں حضرت **مولانا محمد الیاس** رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا زکات کا

درجہ ہدیہ سے کمتر ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صدقہ حرام تھا ہدیہ حرام نہ تھا۔اور اگر چہ زکات فرض ہے اور ہدیہ مستحب مگر بعض دفعہ مستحب کا اجر فرض سے بڑھ جاتا ہے (پھر اس کی مشہور مثالیں مثلاً سلام اور اس کا جواب وضو قبل الوقت وغیرہ بیان کیں،معروفات کے ساتوے درجہ میں دیکھئے)۔

اسی طرح زکات گو فرض ہے مگر اس کا ثمرہ تطہیر مال ہے اور ہدیہ گو مستحب ہے مگر اس کا ثمرہ تطییب قلب مسلم ہے تو ثمرہ کے لحاظ سے یہ افضل ہے کیوں کہ تطہیر مال سے تطییب قلب مسلم کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔اور زکات سے بھی اگر چہ حاجت مند مسلمان کی تطییب قلب ہو جاتی ہے مگر مقصوداً (اصلاً) نہیں بل کہ تبعاً ہے اور ہدیہ سے اصل مقصود ہی تطییب قلب مسلم ہے۔(ملفوظات ۵۳)

حضرت فرماتے تھے ہمارے نزدیک اس وقت امت کی اصل بیماری دین کی طلب وقدر سے ان کے دلوں کا خالی ہونا ہے اگر دین کی طلب وقدر ان کے اندر پیدا ہو جائے۔۔تو ان کی اسلامیت دیکھتے دیکھتے سرسبز ہو جائے ہماری اس تحریک کا اصل مقصد بس دین کی طلب وقدر پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے نہ کہ صرف کلمہ اور نماز وغیرہ کی تصحیح وتلقین (ملفوظات ۷۷)۔

(۸) جب یہ سب تعلیمی حلقوں میں سیکھنا شروع کریں تو ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیں کہ ان چیزوں کا مذاکرہ گھر جا کر بچوں اور مستورات کے سامنے بھی کریں تا کہ مسجد کے دین کا اثر گھروں میں بھی پہنچے [۱]۔

---

[۱] اس کے علاوہ صاحب تحفۃ الائمہ نے کچھ کتابوں کی نشاندہی بھی کی ہے اگر وہ یہاں (ہندوستان میں) دست یاب ہوں تو وہ بھی آپ شامل کرلیں۔

فصل سوم : تبلیغ کی ذمہ داری

حضرات ائمہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاں امامت جیسا عظیم منصب عطا فرمایا ہے وہاں ان کا بڑا فرض یہ بھی بنتا ہے کہ امت کو اپنی محنت سے پورے دین پر کھڑا کریں۔ ادھر امت دینی خیالات میں ایسی بٹ کر رہ گئی کہ اپنے کو حق پرست کہہ کر دوسروں کو مسلم کہنے کے لیے بھی تیار نہیں اور ایک بڑا طبقہ بے دینی کے دلدل میں ایسا پھنس گیا کہ اسے نہ دین وایمان کا احساس نہ خدا ورسول کا شعور۔

ان اہل مدارس ومکاتب اور اہل تصوف کی سعی مشکور کے علاوہ جن کے یہاں دین کے طالبین اور دینی ذوق کے حاملین جمع رہتے ہیں ایسی عمومی دینی محنت کرنے والی جماعت کی شدید ضرورت ہے، جو مختلف خیالات میں بٹی امت کو تسبیح کے دانوں کی طرح سب کو حق پرست طبقہ سے جوڑنے کی اور حق پرستوں کو بے دینی سے نکال کر ان میں خدا ورسول اور دین وایمان کا احساس وشعور بیدار کرنے کی دعوت دے کر پورے دین پر قائم کرنے والی ہو۔

آج سے ۷۰ یا ۹۰ سال پہلے جب دعوتی وتبلیغی محنت کا بچپنہ اور اس کا آغاز تھا، لوگ جماعتوں کو مسجد تو مسجد اپنی بستیوں میں بھی ٹھہرانے کے لیے تیار نہیں تھے! لیکن آج الحمد للہ اس محنت کی وجہ سے کروڑہا لوگوں نے دینی غلط نظریات (آبائی نظریات) سے توبہ کی، کتنے لوگوں نے اپنی غلط زندگیوں اور بے دینی پر منوں آنسوں بہائے گویا اللہ تعالیٰ نے اس محنت کو باطل کی کمر کو توڑنے اور بے دینی کے قلع قمع کرنے کا سبب وذریعہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج نہ صرف ہندوستان بل کہ پوری دنیا میں اس کام کا خیر مقدم کرنے کے لیے بہت بڑی تعداد کا انتظام فرمادیا۔

لوگوں میں اس محنت کی وجہ سے وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے تاریخی بلیغ فرمان سے ظاہر ہوتا ہے۔جس کو مفکر ملت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے۔ان کے ایک گورنر نے یہ شکایت کی کہ نئے مفتوح ممالک میں لوگوں کی کثرت سے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مملکت کے خزانہ و مالیہ پر اثر پڑ رہا ہے۔۔سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو لکھا ''وَیْحَكَ اَنَّ مُحَمَّدًا صَلی اللہُ علیہ وسلم بُعِثَ هَادِيًا وَلَمْ يُبْعَثْ جَابِيًا'' اللہ کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر مبعوث کیے گیے ہیں تحصیلدار بنا کر مبعوث نہیں ہوئے ہیں۔میں اس پر راضی ہوں کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں اور خزانہ خالی ہو جائے۔۔۔(کاروان زندگی ۳۴۰)۔

کام کے بارے میں حضرت مولانا محمد الیاس کا ملفوظ پڑھیے اور ان کی بصیرت و للّٰہیت کا فیصلہ کیجئے فرمایا''میری حیثیت ایک عام مؤمن سے اونچی نہ سمجھی جائے،صرف میرے کہنے پر عمل کرنا بد دینی ہے،میں جو کچھ کہوں اس کو کتاب وسنت پر پیش کر کے اور خود غور وفکر کر کے اپنی ذمہ داری پر عمل کرو میں تو صرف مشورہ دیتا ہوں۔(ملفوظات ۱۶۹)۔

یہی وجہ تھی کہ آپ کے ہم عصر اور قریب العصر جبال العلم،علماء مثلا:مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب ، امت کے حکیم وطبیب علامہ تھانوی صاحب،حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ،حضرت شاہ صاحب،حضرت شیخ زکریا صاحب ،مفکر ملت حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی صاحب،حضرت مولانا محمد یوسف صاحب (حضرت جی) ،حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری،حضرت شیخ زکریا صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی ہمارے یہاں حضرت شیخ ابراراحمد صاحب دہلیوی اور حضرت مفتی احمد بن ابراہیم بیمات صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم اس کے نہ صرف قائل و متفق تھے بل کہ اپنی طاقت کے بقدر اس میں تعاون بھی فرماتے تھے۔

ائمہ کرام خود دین کی دعوت دینے کا اہتمام فرمائیں

امام خود بھی داعی ہو اور اپنے مقتدیوں کو بھی داعی بنائے، اور دعوت کے لیے گھر کو چھوڑ کر باہر گاؤں، دیہاتوں میں جانا پڑے تو ضرور جائے، گھر میں بیٹھے رہنے کی عادت سفر سے مانع نہ بن جائے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا انتظار نہیں فرماتے تھے کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں خود حاضر ہوں، بل کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے داعی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لوگوں تک خود پہنچتے تھے اور حق کی دعوت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی لوگوں کے گھروں تک خود پہنچ جاتے تھے، اور کلمہ حق کی دعوت پیش فرماتے تھے۔ مکہ معظّمہ سے سفر کر کے طائف تشریف لے گئے اور وہاں عبد یالیل رئیسوں کے گھروں پر جا کر تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس تشریف لے جاتے اور ان کو حق کا پیغام پہنچاتے، اور ان کے ترش و تند جوابوں کی پرواہ نہ فرماتے، آخر اسی تلاش میں یثرب کے وہ سعادت مند ملے جن کے ہاتھوں سے ایمان و اسلام کی دولت مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کو منتقل ہوئی۔

امت کو دین پر لانے کا غم۔۔۔ اور جہنم سے بچانے کی فکر۔۔۔ نے ان کو لوگوں کے گھروں اور بیٹھکوں پر جانے کے لیے مجبور کیا۔ تاریخ کے صفحات اس سے بھرے ہوئے ہیں کہ کس طرح انھوں نے سردیوں میں اور گرمیوں میں راحت و آرام کا خیال کیے بغیر لوگوں کے گھروں میں جا کر دین پہنچایا۔ اس لیے ائمہ حضرات کو چاہیے کہ اس کی محنت کر کے اپنی مبلغانہ شان دکھائیں اور وارثین انبیاء کا حق ادا کریں۔

آدمی جس اچھائی کی دعوت دوسروں کو دیتا ہے وہ اچھائی نہ صرف اس میں آتی ہے بل کہ اس کا یقین بھی حاصل ہوتا ہے۔ مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو پوری جدو جہد کا

مدار اسی ایمان ویقین اور اس کی دعوت پر ہے جس کے بے شمار نتائج پوری دنیا میں دیکھے جا رہے ہیں۔ حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے اندر جس چیز کی کمی محسوس کرتا ہوں اس کی میں دعوت دیتا ہوں چاہے وہ فعلی ہو کہ عدمی جس سے وہ چیز زندگی میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت میں امر بالعروف ونہی المنکر کی سخت تاکید کی گئی ہے جس سے خود امر اوامر پر آتا ہے اور ناہی منہیات سے بچتا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر :

امر بالمعروف ونہی عن المنکر (دعوت وتبلیغ) کی اہمیت سے پورا قرآن شریف اور ذخیرۂ احادیث بھرا پڑا ہے۔ ہم اس کو صرف اشارۃً پیش کرتے ہیں۔

(۱) امر بالمعروف ونہی عن المنکر : یعنی گناہوں پر اور ترک عبادت پر روک ٹوک کرنا اور احکام اسلام کی تبلیغ کرنا سارے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے اور بڑے ثواب کا کام ہے۔

(۲) مسلمانوں کا خاص کام جو انہیں تمام امتوں سے امتیاز دیتا ہے بھلائیوں کے لیے کہتے رہنا اور برائیوں سے روکتے رہنا ''امر بالمعروف۔۔۔'' ہے۔

(۳) خسران سے نجات کا مدار ایمان، نیک اعمال اور ایک دوسرے کو نیکی کرنے اور برائی سے رُکنے کی وصیت کرتے رہنے پر ہے۔ ''والعصر ان الانسان۔۔۔''۔

(۴) جو لوگ برائیوں اور گناہوں سے نہیں روکتے وہ بھی عذاب کے مستحق ہیں۔

(۵) جب مسلمان اسے چھوڑ دیں گے تو وہ وحی کی برکات سے محروم ہو جائیں گے۔

(٦) جب تک یہ رہے گا ایمان واعمال صالحہ کی خیریت وسلامتی باقی رہے گی اور ان کی عزت وشوکت باقی رہے گی۔

(۷) تبلیغ اور امر بالمعروف ونہی المنکر صرف علماء وائمہ ہی کے ذمہ نہیں بل کہ سارے مسلمانوں کے ذمے ہے۔

(۸) تبلیغ کرنے والوں پر رحمت نازل ہوتی ہے، اوران کو ہمیشہ ان تمام اعمال کا ثواب ملتا رہے گا جوان کے کہنے سے لوگ عمل کریں گے۔

(۹) جماعت بن کر کام کرنا مقبول و باعث خیر و برکت ہوتا ہے۔ المختصر ائمہ حضرات خود بھی اس تبلیغ کے کام کو انجام دیں اور اپنے مقتدیوں کو بھی اس پر ڈالیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں دعوت الی اللہ کی اہمیت

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوتی مشن کو اس قدر عام کیا کہ امت کو مزاج دعوت بھی عطا کیا اور اسے دعوت پر کھڑا بھی کیا، حضرت مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دعوت اس قدر چلائی کہ اس کی وجہ سے روزے کو معاف کیا۔۔۔ نمازیں قضا ہوئیں۔۔۔ اوران میں تخفیف ہوئی۔۔۔ ابتدا میں تعلیم وتعلّم میں چاہے کمی آئی ہو، ذکر اللہ وعبادت میں کمی آئی ہو لیکن دعوت الی اللہ میں کبھی کمی نہیں آئی کہ ایمان کی بات کہنا چھوڑ دیا ہو۔

حضور مسجد نبوی کے امام تھے دعوت الی اللہ کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اپنی مسجد کا امام بنا کر خود روانہ ہو گئے وہ نماز بھی پڑھاتے تھے اور اذان بھی خود دیتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو پڑھتے تھے ان کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پڑھاتے تھے۔ (مواعظ عبیدیہ ۱۵۴/ ۲)۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ نے جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کی کچھ تفصیل بیان کی ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے وصال کے قریب اسے روانہ کرنے کی پوری تیاری کی تھی اور دو لاکھ نصاریٰ کے مقابلہ کے لیے اسے تیار کیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت ناساز ہونے

کی وجہ سے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے ٹھہر جانے کی درخواست کی تو آپ نے اجازت دیدی پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوگیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو سب سے پہلے جیش اسامہؓ کو روانہ کرنے پر متوجہ ہوئے۔

ایک طرف ارتداد بھی چل پڑا تو صحابہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ جیش اسامہ کو روک لیا جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ تیار نہ ہوئے بل کہ اور بھی جماعتیں بنا کر دوسرے تقاضوں پر بھیجا اور صرف عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس مدینہ میں روکا اور ان کو روکنے پر حضرت اسامہؓ کو جوان کے لیجانے پر مصر تھے راضی کرلیا کہ عمرؓ میرا مشیر ہے میں اکیلا ہوں اگر ضرورت ہوئی تو میں عمرؓ سے مشورہ لے سکوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال سے قبل آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ المنورہ کے سب سے بڑے عالم و مفتی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو بھی راہ خدا میں یمن کے لیے یہ کہہ کر بھیجد یا تھا کہ اب جب تم مدینہ آؤ گے تو ہماری ملاقات نہ ہوسکے گی چناں چہ ایسا ہی ہوا، جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جارہے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا تم یمن جارہے ہو لیکن تمہارے فتویٰ کا کیا ہوگا کیوں کہ مدینہ میں فتویٰ کا کام ان کے سپرد تھا گویا ان کو مفتی کی ڈگری خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی تھی۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال پر وہ مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو یہ کہہ کر شام بھیجد یا کہ اگر میں ان کو روک لوں گا تو ہمیشہ کے لیے نمونہ بن جائے گا کہ ان کو راہ خدا میں (فتویٰ اور مسائل کی ضرورت کی وجہ سے) جانا نہیں چاہیے۔ (مواعظ عبیدیہ ۱۸۱تا۱۸۵/ ۲)۔

مسجد نبوی میں کئی حلقے

حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس عنوان کے تحت وہ حدیث شریف ذکر کی ہے جس میں مذکور ہے کہ مسجد نبوی میں ایک حلقہ تو ذاکرین کا ہوتا تھا اور دوسرا متعلمین کا۔ پھر آپ ’’ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ‘‘فرمایا کر متعلمین کے حلقہ میں بیٹھ گئے۔اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذکر کرتے اور متعلمین کو سکھاتے، مسجد میں بھی سیکھتے سکھاتے، ذکر کرتے کراتے اور مسجد سے باہر بازاروں میں بھی ذکر کرتے اور سیکھتے سکھاتے، اخلاق پر ڈالتے اور یہ ذکر کرنا اور سکھانا بھی تبلیغ ہے۔لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دعوت کا حکم آتا تھا تو پھر ان ہی ذاکرین اور معلمین و متعلمین کو لے کر اور بازار والوں کو لے کر نکل جاتے تھے۔(مواعظ ۱۸۶)۔

آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں پڑھا کہ جب دعوت کا تقاضا ہوتا تو تعلیم وذکر کو چھوڑ کر دعوت کے لیے نکل جاتے تھے۔ یہاں دو باتوں پر توجہ کریں۔ایک صحابہ ؓ کا مدینہ المنورہ جیسی مقدس جگہ کا قیام اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان کے روبرو ہونا۔دوسرا ان کا ذکر و تعلیم کا ذوق وشوق۔ہم سمجھ سکتے ہیں کہ صحابہ کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت آپ کا دیدار نعمت بے بدل تھی جس کی وجہ سے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مدینہ میں ان کا ہر روز، روز عید تھا اور ہر شب، شب قدر۔لیکن دین مبارک کے لیے اس کو قربان کیا۔

دوسری بات صحابہ رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کے مبارک نام کا جو ذکر کرتے ہوں گے اور اس سے لذت ووجد کی جو کیفیت ہوتی ہوگی وہ امت کے کسی فرد کو حاصل ہونا ناممکن ہے۔ ان کے جسم کے روویں روویں سے اللہ اللہ کی صدا اور ہر عضو سے عشق حقیقی کی خوشبو ٹپکتی ہوگی لیکن جانثار صحابہ رضی اللہ نے اس کو بھی قربان کر دیا۔اس سے اندازہ لگائیں کہ ان کے نزدیک دعوت کی کتنی اہمیت تھی اللہ اکبر یہی لوگ تھے جو منشا نبوی کو اپنا دین بنائے ہوئے تھے۔

اللھم ارزقنا اتباعھم۔

پیغمبرانہ دعوت کے چند امتیازی خصائص

شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ پیغمبرانہ دعوت کے چند امتیازی خصائص ہیں:

(۱) امت کی فکر : انبیاء علیہم السلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو اپنی امت کی اصلاح کی فکر اس قدر شدت کے ساتھ لگ جاتی ہے کہ وہ طبعی تقاضوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ جب پیغمبر اس فکر میں گھلنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی کا سامان کیا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے۔'' لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ '' (الشعراء ۳)۔ترجمہ: شاید آپ اس غم میں اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں کہ یہ لوگ مومن کیوں نہیں بنتے۔

یہ جملہ داعیان دین کی تسلی کے لیے ارشاد فرمایا ہے، کیوں کہ مذکور الصدر آداب دعوت کو استعمال کرنے کے باوجود جب مخاطب حق بات کو قبول نہ کرے تو طبعی طور پر انسان کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔

قُطُبَ بننے کا نسخہ

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ''ملفوظات مولانا محمد الیاس'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ''مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ''۔(مسلم ۱/۵۱) کے آخری جز ''فَبِقَلْبِهٖ'' کا ایک درجہ اور اس کی صورت یہ بھی ہے کہ ازالہ منکر کے لیے اصحاب قلوب اپنی قلبی قوتوں کو استعمال کریں۔یعنی ہمت و توجہ کو

کام میں لائیں۔

پھر اسی ذیل میں فرمایا: حضرت امام عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مقام قطبیت حاصل کرنے کی ایک تدبیر لکھی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر جہاں جہاں جو جو معروفات مٹے ہوئے ہیں اور مردہ ہو گئے ہیں ان کا تصور کرے پھر دل میں ان کے مٹنے کا ایک درد محسوس کرے اور پورے الحاح اور تضرع کے ساتھ ان کے زندہ اور رائج کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور اپنی قلبی قوت کو بھی ان کے احیاء کے لیے استعمال کرے۔

اسی طرح جہاں جہاں جو منکرات پھیلے ہوئے ہیں ان کا بھی دھیان کرے اور پھر ان کے فروغ کی وجہ سے اپنے اندر ایک سوزش اور دکھ محسوس کرے، پھر پورے تضرع کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ان کو مٹا دینے کے لیے دعا کرے اور اپنی ہمت وتوجہ کو بھی ان کے استیصال کے لیے استعمال کرے۔ حضرت امام عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ جو شخص ایسا کرتا رہے گا ان شاء اللہ وہ قطب عصر ہوگا۔ (ملفوظات مولانا محمد الیاس ۷۰)۔

لہٰذا داعی اسلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کو اس پیغمبرانہ فکر کا کوئی حصہ نصیب ہو۔ چناں چہ اسلاف امت میں سے جن جن کو اس فکر کا جتنا حصہ ملا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت میں اتنی ہی برکت عطا فرمائی اور اتنے ہی بہتر ثمرات پیدا فرمائے۔

(۲) دعوت کی لگن : انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا دوسرا اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر دعوت میں لگا تار مشغول رہتے ہیں اور حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی بات متواتر کہے چلے جاتے ہیں۔ جہاں اور جس موقع پر کسی شخص کو اچھی بات پہنچانے کا کوئی موقع مل جائے وہ اسے غنیمت سمجھ کر اپنی بات پہنچا ہی دیتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھئے کہ وہ مدت سے عزیز مصر کی قید میں محبوس ہیں۔

گردوپیش میں کوئی ہم نوانہیں، اس حالت میں جیل کے دوساتھی خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے آتے ہیں، سوال کا کوئی تعلق دین ومذہب سے نہیں ہے، لیکن ان کے جواب میں پہلے تو انہیں مطمئن فرما دیتے ہیں کہ تمہارے خواب کی تعبیر مجھے معلوم ہے اور میں تمہیں بتا بھی دوں گا۔''

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ''(یوسف۳۹)۔

ترجمہ : ''اے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق پروردگار (ماننا) بہتر ہیں یا وہ اللہ جوایک اور قہار ہے۔'' اور اس طرح خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے اپنا پیغام انہیں پہنچایا۔

دعوت کی اس لگن کا حاصل یہ ہے کہ انسان بات پہنچانے کے مواقع کی تلاش میں رہے جب جتنا موقع مل جائے اس سے فائدہ اٹھائے اور دعوت سے کسی مرحلے پر تھکنے یا اکتانے کا نام نہ لے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کا داروغہ بن کران کے پیچھے نہ پڑے۔ بل کہ اپنی بات مؤثر سے مؤثر انداز میں کہہ کر فارغ ہو جائے، پھر جب دیکھے کہ اس پر عمل نہیں ہوا تو موقع دیکھ کر پھر کہہ دے۔ لیکن نہ مسلط ہونے کا طریقہ اختیار کرے اور نہ مایوس ہو کر بیٹھ جائے۔

دین کی حفاظت کے طریقے

حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دین کی حفاظت دو طرح سے ہوتی ہے ایک تو بیرونی حملوں کو روکنا۔۔۔ دوسرے خود اندرونی بنیادوں کو مضبوط کرنا۔۔۔ لوگوں نے حفاظت کے صرف یہ معنی سمجھے ہیں کہ اوروں سے لڑنے لگے، یعنی بیرونی حملوں کو روکنا شروع کر دیا اور اس کو کافی سمجھ لیا، بیرونی حملوں کو روکنے سے زیادہ اہتمام اندرونی آثار کے استحکام کا کرنا چاہیے، کیوں کہ حفاظت کے لیے دونوں جز کی ضرورت ہے، ایک بیرونی حملہ سے بچانا، دوسرے اندرونی حالت کو مکمل کرنا۔ اگر اندرونی حالت بالکل خراب ہو تو

حفاظت ہو ہی نہیں سکتی۔

دیکھو اگر کوئی بادشاہ ہو اور وہ ساری فوج کو ختم کر دے، لڑائی کے سارے سامان کو برباد کر دے، سارے خزانے کو لٹا دے اب اگر کوئی بادشاہ اس سے لڑائی کے لیے آمادہ ہو جائے تو کیا (یہ بادشاہ) کامیاب ہو سکتا ہے؟ جب فوج نہیں، خزانہ نہیں، لڑائی کا سامان نہیں تو کیا خاک اپنے ملک کی حفاظت کرے گا؟ اب بتلایئے! اپنے ملک کی حفاظت کیوں نہ کر سکا صرف اسی وجہ سے کہ اس نے اندرونی قوت کو بالکل تباہ اور کمزور کر دیا تھا۔۔۔ اس حالت میں وہ بیرونی حملوں کو کیسے روک سکتا ہے، یہی حالت ہماری ہے کہ ہم حفاظت اسلام کے لیے محض بیرونی حملوں کو دفع کرنا چاہتے ہیں اور اپنی حالت کی تکمیل (واصلاح) نہیں کرتے۔

افسوس! ہے کہ اس وقت فتنہ ارتداد سے مسلمانوں کی گو ایک آنکھ تو کھلی (یعنی بیرونی حملوں کا کچھ بندوبست کیا) ہے۔۔۔ مگر اب بھی ایک بند رہ گئی یعنی اندرونی حالت درست کرنا۔

حضرات میں مکرر کہتا ہوں کہ اندرونی حفاظت کی زیادہ ضرورت ہے، اپنے اسلام کو واضح کرنا، شریعت کا متبع ہونا، یہ اندرونی حفاظت ہے۔ کامل مسلمان بن جانا، احکام شریعت کی پوری طور سے پابندی کرنا یہی نہیں کہ غیروں سے لڑنے لگو۔ بل کہ میں کہتا ہوں کہ خواہ لڑو مت، مگر اپنی حالت کو درست کر لو، ہر شی کا ایک اثر ہوا کرتا ہے اسلام کامل کا بھی ایک اثر ہے۔

واللہ جو کام خارجی قوت سے نہیں ہوتا وہ داخلی قوت سے ہو جاتا ہے۔۔۔ اگر داخلی قوت پکی ہو جائے تو خارجی قوت کی زیادہ ضرورت ہی نہ رہے۔۔۔ پہلے زمانے میں لوگ ہمارے بزرگوں کو دیکھ کر ان کے اعمال ان کے طرز معاشرت کو دیکھ کر اسلام میں داخل ہوتے تھے، کوئی زور زبردستی سے مسلمان نہیں ہوتے تھے۔۔۔ مگر اب ہمارے اعمال خراب، اخلاق خراب، معاشرت گندی، معاملات خراب، اگر کوئی مسلمان ہونا چاہے تو ہماری کیا چیز دیکھ کر ہو۔

(حضرت تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ الاتمام لنعمۃ الاسلام ص ۲۸)

اندرونی حفاظت کی زیادہ ضرورت ہے

اسلام کی حفاظت ایک تو اندرونی ہوتی ہے ایک بیرونی اور زیادہ اہم پہلی ہے۔۔۔ اگر ہم اس کا اہتمام کرلیں تو غیر لوگ خود پست ہوجائیں، اس کے بغیر صرف دوسری قسم میں کوشش کرنا ایسا ہے، جیسے اپنے پاس ہتھیار نہیں، خزانہ نہیں، پھر دشمن کا مقابلہ کریں، میں تلوار، بندوق، توپ، کمان، کو ہتھیار نہیں کہتا، بل کہ ہتھیار سے مراد یہ ہے کہ ہمارے پاس اعمال نہیں، ہمارے اعمال، اخلاق معاشرت بالکل گندے ہیں، اگر ہمارے یہ ہتھیار تیز ہوں تو دوسرا کبھی حملہ نہ کرسکے۔۔ اس کو لڑنے کی ہمت نہ ہوگی، خدا کی قسم اگر ہمارا اسلام کامل ہوتا اور اعمال ٹھیک ہوتے تو کسی کو کبھی ہمت بھی نہ ہوتی، کہ کسی مسلمان کی طرف نظر اٹھائے۔

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اس کی تم کو زیادہ ضرورت نہیں کہ کسی سے لڑو بھڑو اس کی طرف التفات ہی نہ کرو۔ ہاں تم ایسے بن جاؤ کہ ان کو تمہارے مقابلہ کی ہمت ہی نہ رہے۔ اگر تم اپنے اعمال ٹھیک کرلوگے، شریعت کے پورے متبع ہوجاؤگے، معاشرت، معاملات اور اخلاق درست کرلوگے تو وہ کسی مسلمان کو تو کیا مرتد بنائیں ادھر رخ کرنے کی ہمت بھی نہ ہوگی، غرض پہلے اندرونی محافظت کرو اس کی زیادہ ضرورت ہے، خارجی تدابیر کی زیادہ ضرورت نہیں۔

(حضرت تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ الاتمام لنعمۃ الاسلام ص ۱۴)

اہل اسلام کے لیے تو وہی تدابیر نافع ہوں گی، جو اسلام کے مناسب ہیں، وہ تدبیریں یہ ہیں جو اللہ میاں نے بیان فرمائی ہیں کہ اپنی اصلاح کرو، اخلاق درست کرو، عقائد واعمال کو سنوارو۔

اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ دوسرے کو تمہارے بہکانے کی طمع نہ ہوگی، دست درازی کی ہمت نہ ہوگی، یہ تو اپنا ذاتی فائدہ ہے۔۔۔ آگے دوسرا درجہ اشاعت اسلام کا ہے، اس سے بھی

اس میں کامیابی ہوگی۔۔۔ کیوں کہ اسلام کا حسن ایسا ہے کہ دوسروں کے دل کو بھی کھینچتا ہے۔۔۔ اگر تمہارے اندر اسلام کے پورے اوصاف پائیں جائیں گے، تو دوسری قومیں خود ہی اس کے اندر آ جائیں گی زیادہ بولنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ (حضرت تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ الاتمام لنعمۃ الاسلام ص۴۶) (تبلیغ بالیقین کار نبوت ہے ۳۷۷۔۔۔)

حضرت مولانا محمد سعد مدظلہ العالی اسی طرح کی بات کچھ اس طرح ارشاد فرماتے ہیں کہ کسی پوری قوم و جماعت کے مسلمان ہونے سے بہتر یہ ہے کہ ایک شخص مرتد ہونے سے بچ جائے یا ایک مسلمان کے مرتد ہونے سے بچ جانا پوری جماعت کے مسلمان ہونے سے بہتر ہے۔ یعنی اپنی حفاظت دوسروں کی فکر پر مقدم ہے، کتنی پیاری اور عمدہ بات ہے!!

یَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

فصل چہارم :ایمان واعتقاد کی ذمہ داری

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جب بعثت ہوئی تو لوگوں کے عقائد کا حال یہ تھا کہ وہ بت پرست بن چکے تھے اور اخلاق وکردار کا حال یہ تھا کہ شراب خوری، بدکاری اور قتل وغارت گری عام تھی اخلاقی گراوٹ کی ایک لمبی فہرست ہے۔

اب آپ اس پر غور کریں کہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ساری خرابیوں کا علاج کیا کیا! آپ نے ان سب اخلاق وکردار میں سے کسی کی اصلاح سے ابتدا نہیں فرمائی۔

حالاں کہ آپ اس پر قادر تھے کہ آپ ایک معاشرتی اصلاحی نظام کی طرف لوگوں کو بلاتے ،طبقاتی قدروں کو مٹا کر ایک قومیت کی طرف بلاتے اور پورے عرب کے سردار بن جاتے ،لیکن نہ تو اللہ نے اس کا حکم فرمایا نہ تو آپ نے یہ راستہ اختیار فرمایا، کیوں کہ پوری زندگی کی اصلاح کی بنیاد صرف معاشرتی، واخلاقی اصلاح نہیں ہوسکتی، اس کی حقیقی بنیاد تو یہ ہے کہ لوگ حقیقی طور پر اپنے معبود کو پہنچان لیں اور اور اپنے خالق ومالک کو سمجھ لیں۔ ''یا اَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا ''۔

خلاصہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری چیزوں کی طرف دعوت سے پہلے اعتقاد صحیح کرنے کی طرف دعوت پہلے دی انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ لہٰذا لوگوں کی اصلاح میں بنیادی چیز ایمان واعتقاد کو درست کرنا اور یقین کو پختہ کرنا ہے۔ لہٰذا ائمہ کرام بھی اپنے ایمان ویقین کو پختہ کرنے کی طرف توجہ فرما کر مقتدیوں کو بھی اس طرف متوجہ فرمائیں۔ اس فصل میں اسی کا بیان ہے۔

مومن کی پوری زندگی کا مدار ایمان ویقین اور نماز پر ہے اس لیے ہم ان دونوں کو قدرے تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔

ایمان ویقین

جس طرح ائمہ پر مقتدیوں کے افعال واعمال کی درستگی کی ذمے داری ہے مثلاً صفوں کو درست کرانا، وضو ونماز کو صحیح کرانا، (جس کا ذکر امامتی ذمے داری میں ہوا ہے) اسی طرح ان کو معروفات پر کھڑا کرنا اور منکرات سے بچانا وغیرہ کی بھی ذمے داری ہے، جب کہ یہ سب فروعات ہیں۔

اور ایمان ویقین، حساب کتاب کا یقین اور آخرت کا استحضار، اللہ تعالیٰ سے خوف ورجا یہ سب اصول ہیں جن پر اعمال وعبادات کا مدار ہے۔ جب فروعات کی ذمہ داری ائمہ پر ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اصول کی ذمے داری ان پر نہ ہو۔ اس لیے ہم نے ایمانی واعتقادی ایک فصل کو ائمہ کی ذمہ داری کے تحت پیش کیا ہے۔

چناں چہ احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی توجہ دنیا اور دنیوی اسباب کی طرف ہوئی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف اور آخرت کی طرف فرمادی۔ مثلاً تسبیح فاطمہ ارشاد فرمانے کا واقعہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خدمت گار خادم طلب کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تسبیحات پڑھنے کو فرمایا اور فرمایا کہ یہ خادم سے بہتر ہے۔ اسی طرح ایک لشکر نجد کی طرف روانہ فرمایا جب بہت جلد بہت سا مال غنیمت لے کر لوٹا تو ایک شخص کو بہت تعجب ہورہا تھا تو آپ نے اس سے زیادہ مال غنیمت حاصل کرنے والی جماعت بتائی کہ فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک ذکر اللہ میں مشغول رہے۔ یہ لوگ کم وقت میں زیادہ فائدہ حاصل کرنے والے ہیں۔ (مشکوۃ عن عمر بن الخطاب ؓ ۹۰)۔

تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال وغلام کی طرف سے توجہ ہٹا کر آخرت کے کارآمد امور کی طرف پھیر دیا۔ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں۔ قصہ مختصراً لہٰذا ائمہ حضرات کو

چاہیے کہ وہ مقتدی حضرات کی ایمانی فکر فرمائیں۔ انہیں قدم قدم پر آخرت کی طرف متوجہ فرمائیں۔

اور انہیں چاہیے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ شانہ کے ساتھ رب اور معبود ہونے کے لحاظ سے۔۔۔اور حضرت محمد ﷺ کے ساتھ نبی اور رسول ہونے اور امام ومقتدا ہونے کے لحاظ سے۔۔۔اور اسلام کے ساتھ دین ومذہب ہونے کے لحاظ سے۔۔۔اور قرآن عظیم کے ساتھ نظام ودستور ہونے کے لحاظ سے۔۔۔خوب مضبوط جوڑ دیں۔ ''رَضِیۡتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَّبِیًّا '' (مشکوۃ ۳۴)۔اس ایمانی واعتقادی بحث پیش کرنے کا مقصد مذکورہ ساری چیزوں کو ایمان واعتقاد کے ذریعہ پیدا کرنا ہے۔

کیوں کہ ایمان واعتقاد بنیاد ہے جب بنیاد مضبوط ہوگی تو اس پر قائم ہونے والی عمارت بھی مضبوط ہوگی۔ جب ائمہ مقتدیوں کے ایمان کی فکر کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان کے ایمان واسلام کے ساتھ ان کے اعمال وعبادات اور اخلاق کی بھی فکر کر رہے ہیں۔

چناں چہ قرآن کریم نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ ارشاد ہے۔''وَتَرٰی کَثِیۡرًا مِّنۡھُمۡ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ وَاَکۡلِھِمُ السُّحۡتَ ''(مائدہ ۶۲)۔آپ ان میں سے بہت سوں کو دیکھیں گے کہ وہ گناہوں اور ظلم اور حرام کھانوں کی طرف دوڑ دوڑ کر گرتے ہیں۔اس میں یہ جو فرمایا کہ دوڑ دوڑ کر گرتے ہیں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ صرف گناہ کرتے نہیں بل کہ گناہ کرنا ان کی عادت اور طبیعت بن گئی ہے۔

اس سے مفسرین اور علماء اسلام رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ'' ہر ہر معروف ومنکر پر مستقل محنت کے بجائے بہتر یہ ہے کہ کلمہ توحید اور ایمان پر محنت کی جائے۔ کیوں کہ ساری طاعات ومعاصی کا سرچشمہ ایمان ویقین ہے کہ ایمان ویقین کی درستگی اور پختگی

سے بیک وقت سارے گناہوں سے بچنا بھی آسان ہوگا اور ساری طاعات پر کھڑا ہونا بھی۔ اس لیے ہم نے یہ ایک فصل ایمان واعتقاد پر مرتب کی ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے ''اَوَّلُ صَلَاحِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بِالْيَقِيْنِ وَالزُّهْدِ..'' (بیہقی ۷/۲۷ ۴۲۷ از منتخب احادیث ۱۷) اس امت کی اصلاح کی ابتدا یقین اور دنیا سے بے رغبتی سے ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ امت کی اصلاح کا بنیادی مدار ایمان ویقین ہے۔

اسلام کا ایک انقلابی عقیدہ

قرآن کا ارشاد ہے ''وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ''۔ (یونس ۱۰۷)۔ اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی تکلیف وسختی پہنچادیں تو ان کے سوا کوئی نہیں جو اسے دور کر سکے اور اگر وہ کوئی خیر (بھلائی ورحمت) پہنچانے کا ارادہ کرے (پہنچادیں) تو کوئی بھی اس کے فضل کو ٹالنے اور روکنے والا نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔'' مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ''(فاطر ۲) اللہ تعالیٰ جو رحمت لوگوں کے لیے کھول دیں (عطا کریں) اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جو (رحمت) روک دیں اس کے بعد اسے کوئی پہنچانے (کھولنے) والا نہیں۔

مفسر قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مذکورہ آیت شریفہ کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ ضرر ونفع کا یہ وہ اسلامی عقیدہ ہے جس کا صحیح ودرست یقین رکھنے والا مومن ساری کائناتی مخلوق سے بے خوف وبے فکر اور مطمئن ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ اس کا یہ یقین ہوتا ہے کہ ساری کائنات مل کر کوئی ادنی نفع اور ادنی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس کی پختگی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بے سروسامان چھوٹی جماعت، کفار کی بڑی جماعت پر غالب آگئی اور ان پر بھاری ہوئی ایسی کہ جن سے حکومتیں کانپتی تھیں۔ (معارف القرآن ۳/۲۹۳)۔ آپ

نے اس عقیدہ کی اہمیت کو ملاحظہ کیا، واقع میں اگر یہ عقیدہ مسلمانوں میں پختگی کے ساتھ آ جائے تو دنیا ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکے۔ کبھی کبھی ہمیں بھی تو غور کرنا چاہیے کہ ہم میں ایمانی عقیدہ کتنا پختہ ہے!! کیا قرآن کا خطاب ہم سے نہیں؟ کیا قرآن کا خطاب صرف صحابہؓ ہی سے ہے؟ نہیں ہم سب سے ہے تو پھر ہمیں اپنے ایمانوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایمان وشرک اور ان کے نتائج وثمرات کا تجزیہ کرتے ہوئے دو آیتوں کو پیش کر کے لکھا ہے کہ مشرک ہمیشہ خائف ومرعوب رہتا ہے۔

''سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللّٰهِ''۔ (آل عمران ۱۵۱)۔ ہم کافروں کے دلوں میں ان چیزوں کا رعب ڈالتے ہیں جن کو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

اور فرمایا کہ مومن ہمیشہ (جب کہ وہ کامل الایمان ہو) امن وسکون اور اطمینان میں رہتا ہے۔ ارشاد ہے ''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ''۔ (انفال ۸۲)۔ وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنے ایمان کے ساتھ ظلم خلط نہیں کیا (ظلم نہیں کیا) یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن (سلامتی) ہے اور یہی راہ یاب ہیں ۔ یہاں ظلم سے مفسرین نے شرک مراد لیا ہے۔

مؤمنین امن وسلامتی میں اس لیے ہیں کہ وہ ضرر ونفع کے بارے میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا مالک صرف اللہ ہے، لہٰذا اس کے احکام کی تعمیل کر کے ساری مخلوقات کے ضرر ونفع سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ جو صرف اللہ سے ڈرتا ہے تو ساری چیزیں اس سے ڈرتی ہیں'' مَنْ هَابَ اللّٰهَ هَابَه كُلُّ شَيْئٍ''۔ حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک زریں جملہ فرمایا کرتے تھے۔ ''اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے تو ساری چیزیں تم سے ڈریں گی اور اگر تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرو گے تو ساری چیزیں تم کو ڈرائیں گی۔ برخلاف مشرک کے کہ وہ نفع وضرر میں یہ

عقیدہ رکھتا ہے کہ ساری چیزیں اس کی مالک ہیں تو سب کو راضی کرنے کی فکر میں لگ کر بے چین و بے قرار رہتا ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ جامع مسجد میں تشریف فرما تھے اچانک آپ کی گود میں اوپر سے ایک سانپ گرا سارے لوگ بھاگ نکلے اور کود پڑے لیکن حضرت نے نہ تو حرکت کی نہ ہٹے صرف اپنا دامن جھاڑ کے پھینک دیا۔ (مرقات ۲۸/۱)۔ اندازہ کیجے کہ حضرت کا یقین کس قدر پختہ ہوگا۔ (اللھم ارزقنا)۔

لہٰذا ائمہ حضرات مقتدیوں کے ایمان ویقین کو اللہ کی ذات کے ساتھ مضبوط وابستہ کرنے کی کوشش کریں۔ آج ہم سب کا حال یہ ہے کہ ہمارا یقین واعتماد خالق سے ہٹ کر۔۔۔ مخلوقات پر مالک سے ہٹ کر۔۔۔ مملوک پر اور مسبب الاسباب سے ہٹ کر۔۔۔ خود اسباب پر اور آخرت پر سے ہٹ کر۔۔۔ دنیا پر آ گیا۔ اب انتظار صرف اس کا ہے کہ ان چیزوں سے ہمارا اعتماد ویقین ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی ذات عالیہ پر کب آتا ہے!! حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے۔ انبیاء، اولیاء فرشتے سب کے سب محتاج ہیں، نبی بھی جس کام کے لیے بھیجے گئے ہیں نا، اس میں بھی وہ محتاج ہیں، مختار نہیں نبیوں کو ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے لیکن وہ خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے "اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا زور لگا دیا اپنے چچا ابوطالب پر کہ وہ ایمان لے آئیں اور دوسرے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کو کوئی قتل کردے، پر اللہ تعالیٰ وحشی کو ہدایت دے رہے ہیں اور ابوطالب دنیا سے بغیر ہدایت جارہے ہیں۔ (مسجد کی آبادی کی محنت ۲۲)۔

لہٰذا جب تک یقین نہیں بنتا وہاں تک اللہ تعالیٰ کی نصرت ومدد کا کوئی وعدہ پورا نہ ہوگا۔ "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" تم ہی سربلند رہوگے اگر تم (سچے پکے) مومن رہے۔

آدمی پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو سب سے پہلے اپنی طاقت سے پھر اپنی عقل سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، اگر ان سے نہ ہو تو اپنے مددگار (اعزہ واقارب) سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی لیے تو لوگ اپنے تعلقات وروابط بڑھاتے ہیں تاکہ مصیبت کے وقت کام آویں، لیکن یہ سب اسباب ہیں، حقیقی دفاعی طاقت ان میں ہے ہی نہیں، وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے۔ جس طرح کعبۃ اللہ کی زیارت کرنے والے کی شان یہ بتائی کہ اس کی نظر کعبۃ اللہ پر ہو اس طرح یقین کی سب سے پہلی نظر کعبۃ اللہ پر نہیں خود اللہ تعالیٰ پر واقع ہو۔

ہمارے ایمانوں کے کمزور ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم نے ایمان ویقین کے بنانے کی فکر وکوشش نہیں کی ہے، جس طرح ہم نے نماز پڑھنے اور دیگر اعمال کی فکر کسی درجے میں کی ہے۔ جب اعمال کی فکریں ہوئیں تو اعمال انجام دیئے (وہ بھی رسمی اور عادۃً) ظاہر ہے جب ایمان ویقین کی کوئی فکر نہیں کی تو یقین کمزور رہ گیا اور اس کے کمزور ہونے سے خدا کو کوئی نقصان نہیں، نقصان ہمارا ہوا، کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی مددوں سے محروم ہو گیے۔ لہٰذا اپنی وسعت کے بقدر یقین بنانے کی طرف ضرور توجہ فرمائیں۔

حضرت جندب عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ’’کُنَّا عَلَی عَھْدِ النَّبِیِّ صَلَی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غِلْمَانًا حَزَاوِرَۃً تَعَلَّمْنَا الْاِیْمَانَ قَبْلَ اَنْ نَتَعَلَّمَ الْقُرآنَ، ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرآنَ فَازْدَدْنَا بِہٖ اِیْمَانًا۔ (تاریخ کبیر ۲۲۰/۱)۔ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں طاقتور لڑکے تھے، ہم نے قرآن پڑھنے سے پہلے ایمان سیکھا پھر قرآن پڑھا جس کی وجہ سے ہمارا ایمان اور پختہ ہوتا۔ اس حدیث شریف سے صراحۃً معلوم ہوا کہ ایمان بھی سیکھا جاتا ہے، جس طرح علم سیکھا جاتا ہے لہٰذا ہمیں اور مقتدیوں کو ایمان کے سیکھنے اور بنانے کی طرف توجہ ضرور کرنی چاہیے۔

ایمان بالغیب

ایمان کے تحت ایک ایمان بالغیب ہے۔۔۔ایک ایمان بالقدر ہے۔۔۔اور ایک ایمان بیوم الآخرۃ بھی ہے۔۔۔جب تک ان تمام چیزوں پر ایمان نہیں لایا جاتا وہاں تک کوئی شخص مؤمن نہیں ہوتا۔ ہماری توحید و ایمان کا تعلق غیب سے بھی ہے۔ کیوں کہ ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتائی ہوئی ان چیزوں کو بغیر دیکھے اتنی پختگی کے ساتھ مانتے ہیں جتنی ایک کافر کسی چیز کو دیکھ کر مانتا ہے۔ اس طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ''اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا غیب پر کتنا مضبوط ایمان ہوتا تھا اسے ایک حدیث کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں۔

"اخرجَ ابنُ عساکرَ عن انسٍ رَضِیَ اللہُ عنہُ قال: اِنَّ رَسُوْلَ اللہِ صلی اللہُ علیہ وسلمَ دَخَلَ المسجدَ والحارِثُ بنُ مالکٍ رضِی اللہُ عنہ راقِدٌ، فحرَّکہ بِرِجْلِہٖ وَقَالَ "اِرفعْ رَاسَکَ" فَرفَعَ راسَہٗ، فَقَالَ بِاَبِیْ انْتَ وَاُمِّیْ یَارَسُولَ اللہِ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ "کَیْفَ اصبحتَ یَا حارِثُ بنُ مالکٍ، قَالَ اصبحتُ یَارَسُولَ اللہِ مُؤْمِنًا حقًّا قال "اِن لِکُلِّ حقٍّ حَقِیقۃٌ فَمَا حقیقۃُ مَا تقولُ قَالَ عزفتُ عنِ الدنیا، وَاظْمَأْتُ نہارِیْ، وَاسْہرتُ لَیلِیْ، وَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی عرشِ رَبِّیْ وَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی اھلِ الجنۃِ فِیھَا یَتَزَاوَرُوْنَ وَاِلٰی اھلِ النارِ یَتَعَاوَوْنَ، فَقَالَ النبیُّ ﷺ "اَنْتَ اِمْرُؤٌ نَوَّرَ اللہُ قَلْبَکَ عَزفتَ فَالْزِمْ۔ (حیاۃ الصحابہ عربی ۳/۲۳)۔

اس حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حارث بن مالک رضی اللہ عنہ کو پوچھا کہ تم نے صبح کس حال میں کی؟ تو انہوں فرمایا یارسول اللہ اس حال میں کہ میں مؤمن برحق ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تمہاری بات کی حقیقت (دلیل) کیا ہے؟ تو انہوں نے (دلیل میں) فرمایا میں نے دنیا سے اپنی توجہ ہٹالی ہے، دن کو روزے سے ہوتا ہوں، رات کو عبادت کرتا ہوں، اور (حالت یہ ہوتی ہے) گویا میں اپنے رب

کے عرش کا نظارہ کررہا ہوں، اور اہل جنت کو اس حال میں دیکھ رہا ہوتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے (خوشی سے) مل رہے ہیں اور اہل جہنم کو اس حال میں کہ (مارے مصیبت کے) ایک دوسرے پر گرے پڑے ہیں (یا مدد کے لیے پکار رہے ہیں)۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (واقع میں تم مؤمن ہو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل کو منور کردیا ہے اور (واقع میں) تم نے دنیا سے توجہ ہٹالی ہے بس اس کو لازم پکڑلو۔

اس سے آپ نے سمجھ لیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا غیب پر یقین کیسا ہوتا تھا گویا وہ مشاہدہ کررہے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہمارے لیے نمونہ بنایا گیا ہے لہٰذا ان کی طرح ہمیں اور اپنے مقتدیوں کو بھی ایمان بالغیب کو اپنی جہد وکوشش سے ایسا بنانا چاہیے کہ کبھی کبھار جنت وجہنم کا نقشہ ہمارے سامنے بھی کھل جائے کیا یہ غیر ممکن ہے؟۔ اللھم ارزقنا ذلك۔

ایمان بالقدر

تقدیر یا قضاء وقدر پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ بندہ یہ یقین کرے کہ دنیا میں جو کچھ پیش آتا ہے وہ تمام اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ جیسے حدیث شریف ہے کہ تقدیر کا قلم جو کچھ ہونے والا تھا انہیں لکھ کر فارغ ہوچکا اور صحیفے خشک ہوچکے۔ جس میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ کوئی بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک وہ چار باتوں پر ایمان نہ لائے۔ (۱) اس امر کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کا رسول ہوں اور مجھ کو اللہ تعالیٰ نے حق (دین اسلام) کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) مرنے پر ایمان لائے۔ (۳) اس بات پر ایمان لائے کہ موت (برحق) ہے اور موت کے بعد دوبارہ زندگی ہے۔ (۴) تقدیر پر ایمان لائے۔ (مشکوٰۃ ۲۲)۔

حضرت ابن دیلمی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میں اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ تقدیر کے متعلق میرے دل میں (یہ) شبہ پیدا ہو گیا ہے (کہ اگر سب کچھ من جانب اللہ ہے اور تقدیر کے تحت ہے تو پھر اوامر ونواہی اور ثواب وعذاب کی باتوں کا کوئی مطلب نہیں)۔ لہٰذا میرے سامنے کوئی حدیث بیان کیجئے جس سے اللہ تعالیٰ میرے اس شبہ کو دور کر دے۔ انہوں نے (حدیث بیان کرتے ہوئے) کہا حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آسمان وزمین والوں کو (جس میں تمام فرشتے، انسان اور انبیاء ہیں) عذاب میں مبتلا کرے تو وہ عذاب میں مبتلا کر سکتا ہے پھر بھی وہ ان پر ظلم کرنے والا کہا نہ جائے گا۔

اور اگر وہ ان سب کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہوگی۔ اور (یاد رکھو) اگر تم اُحد پہاڑ کے برابر سونا بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ اس کو اس وقت تک قبول نہ کرے جب تک تم تقدیر پر (پوری طرح) ایمان نہ لے آؤ (نیز) اس بات کو خوب جان لو جو کچھ تمہیں پہنچا وہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو تم تک نہ پہنچتی، اور جو نہیں پہنچی وہ ایسی نہ تھی جو تمہیں پہنچتی۔ اور اگر تم نے اس دنیا سے اس (مذکورہ) حالت کے علاوہ پر کوچ کیا یعنی انتقال کیا (کہ تقدیر پر تمہارا ایمان نہیں تھا) تو تم یقیناً جہنم میں جاؤ گے۔ (مشکوٰۃ ۲۳)۔

حدیث شریف کا مطلب واضح ہے کی نفع ونقصان خوشی ورنج جو بھی پہنچے اس بارے میں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ میری کوشش سے ہوا، اگر کامیابی نہ ملے تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اگر میں کوشش کرتا یا میں اس طرح کرتا تو کامیابی حاصل ہو جاتی۔ کیوں کہ پانا اور نہ پانا انسان کے اپنے بس کی بات نہیں بل کہ تقدیر سے وابستہ ہے، مؤمن ہر حال میں تقدیر کے فیصلہ پر راضی رہتا ہے۔ قضاوقدر پر جب تک ایمان پختہ نہ ہوگا اعصاب وقلب کو سکون نہ ملے گا، اور نفسیاتی الجھن ختم نہ ہوگی اور شکوک وسوسے دور نہ ہوں گے۔

ایک صحیح حدیث میں ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم مانگو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مانگو، مدد چاہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور جان لو کہ سارے لوگ جمع ہو کر تمہیں فائدہ پہنچانا چاہیں تو وہی فائدہ پہنچا سکیں گے جو اللہ تعالیٰ نے (تقدیر میں) لکھ لیا ہے اور اگر سارے لوگ تمہیں نقصان پہنچانا چاہیں تو وہی نقصان پہنچا سکیں گے جو اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے۔

لہٰذا یہ مت سوچو کہ گرتی دیوار کو آپ بچالیں گے، پانی کو بہنے سے روک دیں گے، شیشہ کو ٹوٹنے سے بچادیں گے، نہیں ایسا نہیں ہوسکتا، اگر آپ نے اسباب سے کام لیا پھر بھی وہ ہوجائے جس کا اندیشہ تھا تو کہئے کہ یہی مقدر تھا۔ یہ نہ کہیں کہ کاش میں نے ایسا کیا ہوتا تو ایسا ہوتا۔۔۔

جو تقدیر پر راضی نہ ہوگا وہ اضطراب و بے چینی کا شکار ہوگا، وہ یہ سمجھے گا اس کی روزی ناقص ہے اور راحت کم اور مصائب زیادہ۔ اور یہ سمجھے گا کہ جتنا اللہ نے دیا ہے وہ اس سے زیادہ کا مستحق تھا۔ وہ مرتبہ والا اور بڑا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو کم کردیا۔ ظاہر ہے اس کیفیت کے ساتھ وہ کیسے مطمئن ہوگا۔ حزن وغم کو پالنا ایک جنون ہے۔ یہ سوچے کہ کل جو ہوا اس وقت بھی میرا رب میرے ساتھ تھا آنے والے کل بھی وہ ساتھ رہے گا پھر حزن وغم کی کیا ضرورت۔

(۱) لکھا ہے کہ علامہ ابن الاثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شاہ کار کتابیں مثلاً جامع الاصول اور النہایۃ اسی وجہ سے لکھیں کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے۔

(۲) امام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ''المبسوط'' کی پندرہ جلدیں اس وقت لکھیں جب انہیں کنویں میں بند کردیا گیا تھا۔

(۳) ابن القیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''زاد المعاد'' حالت سفر میں لکھی۔

(۴) علامہ قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مسلم کی شرح کشتی پر لکھی۔

(۵) علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے تمام فتاویٰ اسیری کی حالت میں لکھے گئے۔

(۶) بہت سے محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے ہزاروں اور لاکھوں احادیث جمع کیں کیوں کہ وہ غریب وفقیر اور اجنبی تھے۔ (از ترجمہ لاتحزن ڈاکٹر عائض کرنی ۱۲۶)۔

اپنے آپ کو مصیبتوں کا سامنا کرنے کا ایسا عادی بنائیں جیسے اونٹ صحرا میں چلنے کا عادی ہوجاتا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو ذبح کردیا گیا۔ حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کو ستایا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ خون میں نہلائے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کردیئے گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نیزہ مارا گیا اور علماء وائمہ کو کوڑے مارے گئے، جیل میں ڈالے گئے۔ (غم نہ کیجئے ۳۳)۔

ایمان بیوم الآخرۃ

یعنی یہ یقین کرنا کہ موجودہ زندگی بس صرف امتحان ہے، بہت جلد یہ زندگی ختم ہوجائے گی یہ پائدار نہیں ہے بل کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہے جس میں اپنے خالق ومعبود کے سامنے پوری زندگی کا حساب دینا ہے۔

حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ عقیدۂ آخرت نہ صرف شرعی طور پر ضروری ہے بل کہ عقلی طور پر بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ موجودہ زندگی کے اصلاح وسدھار میں اس کا بڑا دخل ہے۔ کوئی عقل سلیم کا مالک اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا کہ برائیوں اور گناہوں سے آخرت کا یقین انسانوں کو جس قدر بچاتا یا بچاسکتا ہے کوئی دوسری چیز یا کوئی انسانی نظام اس قدر نہیں بچاسکتی۔

بے شک حکومتی قانون اور تہذیبی ترقی یا بھلائی برائی کا اندر کا احساس اور نفس کی خود کی شرافت بھی برائیوں سے بچانے والی چیزیں ہیں، لیکن اتنی مؤثر نہیں جتنا کہ مرنے کے بعد جزا وسزا کا عقیدہ اور اس کا یقین بشرطیکہ وہ عقیدہ اور یقین زندہ ہو بے جان نہ ہو۔ (دین وشریعت ۶۷)۔

شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ کسی انسانی ذہن میں جرم کا بیج اس وقت پڑتا ہے جب وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کے کرتوت کو نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے نہ اس جرم پر گرفت کرنے والا کوئی ہاتھ ہے اور نہ اسے اپنی زندگی کا کسی کے سامنے حساب دینا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی سزا پانا ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں جو لوگ نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر اور نہ حساب کا خوف رکھتے ہیں نہ عقاب کا اور نہ اپنے پر کسی بڑی ذات کا تصور رکھتے ہیں وہ یقیناً جنگلی درندوں کی طرح ہوں گے دوسروں پر ظلم وزیادتی بھی کریں گے ان میں کا بڑا چھوٹے پر ظلم کرے گا اور ان میں کا قوی ضعیف کو کھا جائے گا۔ لیکن جو لوگ آخرت اور اس کی جزا وسزا کے عقیدہ و یقین سے مالا مال ہوں گے وہ یقیناً ان گناہوں سے اور دیگر اس طرح کے گناہوں سے ضرور محفوظ ہوں گے۔

ایمانی اس پوری بحث کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ائمہ حضرات اپنی طرح مقتدیوں کے ذہن میں یہ بٹھا دیں کہ معاشرہ کی برائیاں۔۔۔خاندانی عداوتیں۔۔۔گھروں کے تنازعات۔۔۔آپسی رنجشیں۔۔۔اور جان ومال کے خطرات۔۔۔اسی وقت ختم ہوں گے جب معاشرہ اللہ تعالیٰ کی ذات عالیہ اور آخرت کے یقین سے معمور ومنور ہوگا۔ لہٰذا معاشرہ کا ہر فرد اپنے یقین وایمان کے بنانے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے صرف چند اعمال مثلاً نماز وروزہ ادا کر لینے پر مطمئن نہ ہو،

یہی وجہ ہے کہ ایک شخص پابند صوم وصلوٰۃ ہو کر بھی غیبت کرتا۔۔۔یا چوری کرتا۔۔۔یا کسی کو ستاتا ہے۔۔۔اسی طرح ایک شخص دیندار وعالم ہے لیکن اس کے شر سے پڑوسی محفوظ نہیں ۔۔۔خود اس کے والدین ناراض ہیں۔۔۔یا وہ کبر وحسد میں مبتلا ہے۔۔۔یا دین کے خاصے

حصہ پر عمل کرنے والا ہے لیکن زبان ایسی سخت ہے گویا پتھر پھینک رہا ہے۔۔۔ دوسروں کے دل کو زخمی وچھلنی کرتا ہے۔۔۔اور ہر وقت غصّے میں بھرا رہتا ہے۔ **حضرت مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی** رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ ایمان کی دعوت (اصل ہے) اس کے علاوہ سب مفروع عنہا ہے دین کی کمزوری اور بڑے بڑے گناہ ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ہے۔ ایمان قوی ہو اور پھر گناہ ہو یہ ہو نہیں سکتا۔ (مواعظ عبیدیہ ۲۲۰)۔

خلاصہ یہ کہ جس کا جس قدر ایمان مضبوط ہوگا اسی قدر اس کا اسلام اچھا ہوگا اور اس کے ظاہری وباطنی اعمال واخلاق درست ہوں گے اسی لیے ہر فرد کو اپنے اپنے ایمان ویقین کے پختہ کرنے کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

حصول ایمان اور سوءِ خاتمہ سے بچاؤ کے کچھ اسباب ہیں، مقتدیوں کو ان اسباب کے اختیار کرنے کی ترغیب دیں اور اس کی تاکید فرمائیں ہم ذیل میں اختصار کے ساتھ اس کے اسباب پیش کرتے ہیں۔

تقویت ایمان کے اسباب

(۱) ایمان کامل کی دعوت دینا: تقویتِ ایمان کا مؤثر اور قوی سبب دعوتِ ایمان ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تجدید ایمان کے لیے ایک دوسرے کو ایمان کی دعوت دیا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ''كَانَ عَبْدُاللهِ بْنِ رَوَاحَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ إِذَا لَقِيَ الرَّجُلَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ تَعَالَ نُؤْمِنْ بِرَبِّنَا سَاعَةً ۔کبھی یہ فرماتے ''قُمْ بِنَا نُؤْمِنْ سَاعَةً'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے ''قُمْ بِنَا نَزْدَادَ اِيْمَانًا'' (حیاۃ الصحابہ عربی ۳/ ۱۳، ۱۴)۔

حضرت مولانا عبیداللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دعوت کے دو فائدے ہیں۔ایک فائدہ داعی کو ہوتا ہے اس کا خدا کی طرف سے وعدہ ہے۔۔۔اور دوسرا فائدہ مدعو کو ہوتا ہے لیکن خدا کی طرف سے اس کا وعدہ نہیں۔۔۔داعی کے لیے خدا کی طرف سے وعدہ ہے کہ اس کے ایمان کو قوی کریں گے۔''وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا''اس میں لام تاکید اور نون تاکید ہے کہ ہم ضرور بالضرور ہدایت دیں گے۔کس کو جو دعوت دیں گے۔(مواعظ عبیدیہ ۲۰۷/۲)۔

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ ''جَاھَدُوْا''میں صرف قتال بالکفار ہی مراد نہیں ہے بل کہ اس سے دینی نصرت اور اہل باطل کی تردید مراد ہے، اور اس کا سب سے بڑا حصہ اور بڑا سبب امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے اور جہاد سے جہاد بالنفس مراد ہے کیوں کہ وہی جہاد اکبر ہے۔ہدایت دینے سے مراد ایمان کے راستوں کی راہ نمائی ہے یعنی ثابت قدمی۔پھر حضرت ضحاک رحمہ اللہ تعالیٰ سے آیت کی تفسیر کی ہے'' وَقَالَ الضَّحَاکُ : مَعْنَی الْاٰیَۃِ. وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِی الْھِجْرَۃِ لَنَھْدِیَنَّھُمْ. سُبُلَ الثَّبَاتِ عَلَی الْاِیْمَانِ''(قرطبی ۳۶۵/۱۳)۔

خلاصہ یہ کہ ائمہ حضرات مقتدیوں کو ایمانی دعوت میں لگائیں اس سے ان کے ایمانوں کی حفاظت بھی ہوگی اور ان کے ایمانوں کی سطح بلند بھی ہوگی!اور ایمان میں تقویت پیدا ہوگی پھر ہمیں کیا چاہئے؟یہی تو مطلوب ہے۔

(۲) معرفت کے لیے مخلوقات الٰہیہ پر غور وفکر کرنا : کلام الٰہی میں عقلمندوں کو معرفت الٰہیہ کے حصول کے لیے مخلوقات میں غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ مخلوقات کے خالق کو پہچانیں۔مثلاً ''وَمِنْ اٰیَاتِہٖ اَنْ خَلَقَکُمْ مِنْ تُرَابٍ....وَمِنْ اٰیَاتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ

مِن اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجاً ...وَمِنْ اٰیاتِہٖ یُرِیکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمعًا ...،وَمِنْ اٰیاتِہٖ مَنَامُکُمْ بِاللَّیْلِ وَالنَّھَارِ ...،وَمِنْ اٰیاتہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.... '' (روم رکوع ۴)۔ ان آیتوں میں '' ایات '' سے نشانیاں اور خدا کی قدرتیں مراد ہیں، قرآنی آیتیں مراد نہیں۔ جب خدائی نشانیوں اور خدائی مخلوقات پر آدمی غور وفکر کرے گا تو اس کے خالق وقادر کو پہچانے گا جس سے اس خالق وقادر کا یقین پیدا ہوگا اور ایمان ویقین میں تقویت پیدا ہوگی لیکن یہ اسی کو حاصل ہوگا جس میں عقل وبصیرت ہو اور درست طور پر غور کرے جیسا قرآن نے فرمایا۔ '' لِقَوْمٍ یَعْقِلُوْنَ، لقَومٍ یَّتفَکَّرُوْن، لِاُولِی الْاَبْصَار ''۔ جیسا کہ اس کا ذکر ہم نے معرفت کی بحث میں کیا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی ان غیبی مددوں کو بولنا جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوئی۔ ارشاد ہے اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم آپ پر پچھلے نبیوں کے واقعات وحی کرتے ہیں آپ کے دل کو جمانے کے لیے۔ (سورۃ ھود ۱۲۰)۔

- اللہ تعالیٰ کی توحید کو روزانہ بولنا کہ کرنے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔
- صحابہ کرام کے ساتھ جو ظاہر کے خلاف غیبی نصرتیں ہوئی ہیں ان کو خوب بولنا۔
- ایمان کی علامتوں کو خوب بولنا تا کہ ہمارے اندر ایمانی کمزوری کا احساس آجائے

(مسجد کی آبادی کی محنت ۲۰ تا ۳۸)۔

(۴) موجودہ ایمان پر شکر بجالانا۔ یعنی ہر روز موجودہ ایمان پر شکر ادا کرنا۔ کیوں کہ وعدہ ہے '' لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ '' اگر تم شکر کروں گے تو ہم نعمتوں میں ضرور اضافہ کریں گے۔ پس ایمان پر شکر ایمان کی بقا بل کہ اس کی تقویت وترقی کا ذریعہ ہے۔

تنبہ : تقویت کے اسباب کے بعد ہم ذیل میں حسن خاتمہ کے اسباب بھی بیان کرتے ہیں۔ دونوں طرح کے اسباب کو خود بھی حاصل کرنے کی کوشش کریں اور نمازیوں بل کہ تمام

مسلمانوں کو بھی فکر دلائیں کیوں کہ زندگی میں سب سے قیمتی چیز ایمان ہے اس متاع عزیز کی حفاظت تاموت زندگی کا مقصد ہے۔

حسن خاتمہ وحفاظت ایمان کے اسباب

مذکورہ بالا تقویت کے اسباب کے بعد مناسب سمجھ میں آتا ہے کہ حسن خاتمہ کے اسباب کو بھی بیان کیا جائے کیوں کہ حسن خاتمہ اور تقویت ایمان بالفاظ دیگر حفاظت ایمان دونوں نعمتیں مترادف اور لازم ملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان عظیم نعمتوں سے ہمیں سرفراز فرمائیں۔ آمین۔

(۱) ہر فرض نماز کے بعد معنی کا استحضار کر کے "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّاب" پڑھنا۔ آیت شریفہ میں رحمۃ سے کیا مراد ہے؟ علامہ آلوسی بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ رحمت سے مراد استقامت علی الدین ہے "وَ هُوَ اَلتَّوْفِيْقُ لِلثبات عَلَى الْحَقِّ"۔ (روح المعانی ۳؍۱۲۰)

حدیث شریف میں بھی یہ دعا پڑھنا وارد ہے۔ "عن عائشة رضی اللہ عنہا، وَلَا تُزِغْ قَلْبِيْ بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنِيْ۔" (مشکوٰۃ ۱۰۸)۔

(۲) صدقہ (صدق دل سے) دیتے رہنا۔ حدیث شریف میں ہے کہ صدقہ دینا رب کے غضب وغصہ کو بجھا دیتا ہے، اور سوء خاتمہ کو دفع کرتا ہے "تَدْفَعُ مِيْتَةَ السَّوْءِ" (مشکوٰۃ ۱۶۸)۔

(۳) والدین کو راضی رکھنا۔ ایک حدیث شریف کا واقعہ مشہور ہے ایک شخص کی زبان پر بوقت وفات کلمہ جاری نہیں ہو رہا تھا آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس کی والدہ ناراض ہے، جب اس کو راضی کر لیا تو فوراً زبان پر کلمہ جاری ہو گیا۔ معلوم ہوا والدین کی نافرمانی بھی سوء خاتمہ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ والدین کی فرماں برداری کرنے والے کا خاتمہ اچھا ہوتا

ہے چناں چہ حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''اَلبارُّ لَا یَمُوْتُ مِیتَۃَ السّوْءِ'' (تاریخ یحییٰ بن معین ۲/۲۷۴)۔

(۴) مسواک کرنے کا اہتمام رکھنا۔سنت مسواک کی برکت کے بارے میں علامہ شامی ابن عابدین فرماتے ہیں ''وَمِنْ مَنَافِعِہٖ تَذْکِیْرُ الشَّھَادَۃِ عِنْدَ الْمَوْتِ رَزَقَنَا اللّٰہُ تَعَالیٰ بِمَنِّہٖ وَکَرَمِہٖ'' (شامی ذکریا ۱/۲۳۶)

(۵) حصول ایمان کی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا۔حضرت شیخ ابرار احمد دہلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے علوم کی ایک جھلک کے تحت فرمایا: سورۂ فلق اور سورۂ ناس کی گیارہ آیتوں کے تفصیلی مضامین سے معلوم ہوا کہ شیطان سے بار بار پناہ مانگنا اور حصول ایمان کی دعا کرنا حفاظت ایمان کا ایک طریقہ ہے (فیض ابرار ۱/۱۹۷)۔

(۶) اذان کے بعد کی دعا پڑھنا۔کیوں کہ اس دعا کے پڑھنے پر وعدہ ہے'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''حَلَّتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ'' ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ اس جملے پر فرماتے ہیں ''فَفِیْہِ اِشَارَۃٌ اِلٰی حُسْنِ الْخَاتِمَۃِ'' ۔(مرقات باب الاذان ج ۲)

- یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ دعا کو بکثرت پڑھنا۔
- بدنظری سے اجتناب کرنا۔
- اہل اللہ کی صحبت اختیار کرنا۔وغیرہ۔

نماز نماز نماز

نماز نام ہے مخلوقات سے کلی طور پر منقطع ہو کر خالق ومعبود کے ساتھ کلی طور پر

جڑنے کا۔اسی لیے نماز میں قالب وقلب ظاہر وباطن دونوں توجہ مطلوب ہے۔اسی لیے نماز تعمیر حیات کا ذریعہ ہے،اسی پر دنیا وآخرت کی کامیابی منحصر ہے۔جب نماز بنتی ہے تو طاعت وعبادت ،اخلاق ومعاشرت اور زندگی کے سارے شعبے درست ہوجاتے ہیں۔

(۱) نماز کی ابتدا اس وضو سے ہوتی ہے جس کو ''غسل صغیر'' کہتے ہیں۔

(۲) نماز کا انعقاد وآغاز اس مبارک کلمہ ''اللہ اکبر'' سے ہوتا ہے جس کی قوت وطاقت کے سامنے کائناتی ساری طاقتیں ہیچ ہیں۔اس مبارک کلمہ کو رات ودن کی اذان واقامت اور نماز میں تقریباً تین سو بار کہلایا گیا ہے۔جس خدائی عظمت وبڑائی سے مخلوقات کی ساری حیثیتیں بھلادی جاتی ہیں۔

(۳) نماز سے اعلی درجہ کا تواضع پیدا کرایا گیا ہے۔

(۴) پھر جماعت کی نماز پانچ وقت مقرر کی گئی جس سے مسلمانوں کو (ٹائم مینج منٹ) نظام الاوقات کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۵) اس سے بڑھ کر جماعت مشروع کر کے اعلی درجہ کا ''اتحاد واتفاق'' کا درس دیا گیا ہے۔

(۶) پھر نماز کا اختتام ''السلام علیکم'' یعنی امن وسلامتی پر کیا گیا ہے۔سوچئے نماز میں کیا کیا چیزیں ہیں۔

صرف ایک رکن نماز نے انسان کو طہارت ونظافت دی۔۔۔دلوں کو خدائی عظمت کی غذا بھی دی۔۔۔تواضع وانکساری بھی دی۔۔۔تو نظام زندگی کا دستور بھی دیا۔۔۔اتحاد واتفاق کی ناقابلِ تسخیر قوت بھی دی۔۔۔اور باسلامت زندگی بھی دی۔(اللھم لك الحمد علی نعمت الایمان والاسلام)

(۱) نماز اور مسائل زندگی کا حل

نماز اللہ تعالیٰ کے خزانوں سے لینے کا ذریعہ ہے ''مِفتاحُ الجنۃِ الصلوٰۃُ'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ'' اے ایمان والو صبر اور نماز کے ذریعہ سہارا حاصل کرو۔

جب آپ پر خوف طاری ہو مصائب آپ کو گھیر لیں، بیماریاں ستائیں، تفکرات چھا جائیں تو فوراً نماز کی طرف توجہ فرمائیں۔ دل کو قرار آجائے گا۔ روح سرشار ہو جائے گی، غم وفکر کے بادل چھٹ جائیں گے۔ لیکن اس وقت جب نماز، نماز ہو، یقین والی ہو اور نماز کو بنانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ صرف ارکانوں کو ادا کر لنے سے خدائی مدد کا ذریعہ نہیں بنے گی تا آں کہ نماز کو فکر و کوشش سے بنایا نہ جائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نماز جیسی پڑھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ حدیث شریف میں ہے ''کَانَ رجلٌ اِذَا اَسْلَمَ عَلَّمَہُ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم الصَّلٰوۃَ'' (مشکوٰۃ ۲۱۸)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نو مسلم کو سب سے پہلے نماز سکھاتے تھے۔ کس قدر نماز کی اہمیت تھی! کیا ہمیں اس کی ضرورت نہیں!!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی اہم مسئلہ پیش آجاتا تھا تو آپ نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے، ''کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا حَزَبَہٗ اَمْرٌ صَلیّٰ'' (مشکوٰۃ ۱۱۷)۔ آخر اس کی کیا حکمت اور کیا وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام احوال میں نماز کی طرف توجہ فرماتے تھے۔ علمائے اسلام نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کی نیت باندھنے سے اور نماز شروع کرنے سے نماز کی حالت میں عالم ربوبیت منکشف ہو جاتا ہے جس سے ساری کائناتی مخلوقات کی بے بسی شان اور ان کی بے حیثیتی شان کھل جاتی ہے۔ صلوٰۃ خوف کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ جب دلوں پر خوف طاری ہو، جانیں تلوار کی دھار پر رکھی ہوئی ہوں تو دل کو جمانے اور ڈھارس بندھانے والی سب سے بڑی چیز نماز ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''البدایۃ'' میں حضرت ابو سبرۃ نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک مؤمن (کامل) یمن کا رہنے والا گدھے پر سوار کہیں جا رہا تھا، دوران سفر وہ گدھا مر گیا۔ اس نے وضو کیا پھر بڑی عاجزی سے دو رکعت نماز پڑھی اور پھر خوب الحاء و زاری سے فریاد کی کہ اے اللہ میں مدینہ المنورہ سے محض آپ کی رضا کے خاطر جہاد کے لیے نکلا تھا، میں اس کا یقین کرتا ہوں کہ آپ مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس کو زندہ فرمائیں، چناں چہ وہ گدھا کان جھاڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ واقعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش آیا تھا۔ محدِّث حضرت امام شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اس گدھے کو کوفہ کے بازار میں فروخت ہوتے دیکھا ہے۔ (البدایۃ ۶/۲۶۸)۔

ایمان و یقین اور نماز کے بننے پر اس طرح کی خدائی نصرتیں ایک دو بار نہیں بل کہ ہزاروں مرتبہ نبی کو چھوڑ کر خود امتیوں کے ساتھ ہوئیں ہیں۔ آپ اس کے لیے حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم حصہ سوم حضرت **مولانا محمد یوسف کاندھلوی** رحمہ اللہ تعالیٰ کا مطالعہ فرمائیں۔ ہم حیاۃ الصحابہ کتاب کے ابواب کے دو چار عنوان بتاتے ہیں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ خدا نے کیا کیا نصرتیں فرمائی ہیں۔۔۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے جنات اور شیاطین کا مسخر ہونا۔۔۔ صحابہ کرام کا بے جان چیزوں کی آوازیں سننا۔۔۔ صحابہ کرام کا قبر والوں کی باتیں سننا۔۔۔ صحابہ کرام کے مرنے کے بعد باتیں کرنا۔۔۔ صحابہ کرام کے مردوں کا زندہ ہونا۔۔۔ درندوں کا صحابہ کرام کے تابع ہونا اور ان سے باتیں کرنا۔۔۔ صحابہ کرام کے مال میں برکت ہونا۔۔۔ تکلیفوں اور بیماریوں کا (علاج کے بغیر) دور ہو جانا۔۔۔ زہر کے اثر کا چلے جانا۔۔۔ گرمی اور سردی کا اثر نہ کرنا۔۔۔ ٹہنی کا تلوار بن جانا۔۔۔ دنیا کے نظام میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں۔۔۔ وغیرہ۔

ہمارے یہاں گجرات کے ایک بڑے عالم خطیب الامت **حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب دہلیوی** رحمہ اللہ تعالیٰ گزرے ہیں وہ فرماتے تھے جب نماز عطا کرنے کا موقع آیا تو اللہ نے آں حضرت ﷺ کو زمین پر سے آسمان و عرش پر بلایا۔ اور جب نماز سکھانے کا موقع آیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آسمانوں پر سے زمین پر اتارا اور آں حضرت ﷺ کو پورا طریقہ سمجھایا ۔حضرت فرماتے تھے یہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے کر اکر یہ سمجھایا گیا کہ اوپر نیچے کے سارے مسائل کا حل اس نماز میں ہے جس کو اوپر سے اتارا گیا ہے۔ (فیض ابرار ۱/۲۲۳)۔

نیز آپ اس پر غور کریں کہ مذہب اسلام میں جب آسمانوں پر سورج یا چاند گرہن ہوتا ہے تو اس وقت نماز پڑھی جاتی ہے۔ جس کو صلوٰۃ خسوف اور صلوٰۃ کسوف کہتے ہیں، جس میں گویا اس طرف اشارہ ہے کہ فرش پر پڑھی جانے والی نماز کا اثر عرش یعنی آسمانوں پر ہوتا ہے۔ اور یہ کامیابی کیوں حاصل نہ ہو جب کہ شریعت نے کلمات اذان ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' کے ذریعہ اس کی طرف ہم کو بلایا ہے اور قرآن کریم نے ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝'' کے ذریعہ ہمیں اس کامیابی سے ہمکنار ہونے کی خبر بھی دی ہے، یعنی اذان کے ذریعہ جس کامیابی کی طرف بلایا گیا ہے وہ کامیابی نماز میں ہے جب کہ نماز میں خشوع ہو۔

اس بارے میں **حضرت مولانا محمد الیاس** رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اقامت صلوٰۃ ساری زندگی کو درست کرنے والی شئی ہے لیکن اقامت صلوٰۃ کی تکمیل ہوگی ان اوصاف کے پیدا کرنے سے جن کا ذکر نماز کے سلسلہ میں قرآن مجید میں متفرق طور پر کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا گیا۔ ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ ''۔ اور سورۃ بقرۃ کے شروع میں۔ '' اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ'' کے بعد فرمایا گیا۔ ''اُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ''ان دونوں آیتوں کے ملانے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ''خشوع فی الصلوٰۃ'' بھی

''اقامت الصلوٰۃ'' میں داخل ہے اور بغیر خشوع کے نماز پڑھنے والے ''مقیمین الصلوٰۃ'' نہیں ہیں۔ (تو پھر وہ مفلحین بھی نہیں)۔

اور نمازوں میں خشوع پیدا کرنے کی ترکیب وتدبیر کی طرف دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حضوری کے یقین کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔ ''وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ○الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ''۔ (البقرۃ ۴۵/۴۶)۔ فرمایا ''مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ'' کو آخرت سے مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اللہ کے بندوں کو نماز کی حالت میں جو حضوری نصیب ہوتی ہے وہ بھی اس کی مصداق ہے۔

فرمایا ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ'' اور ''اُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' میں جس فلاح اور کامیابی کا وعدہ ہے اس کو صرف فلاح اخروی ہی میں منحصر کرنے کی کوئی وجہ نہیں، بل کہ دنیا میں کامیابی وکامرانی بھی اس میں داخل ہے اور مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ ایمانی اوصاف ہوں ہماری غیبی مدد دنیا میں بھی ان کا راستہ صاف کرنے اور فلاح وکامرانی تک ان کو پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔ (ملفوظات مولانا الیاسؒ ۱۳۱)۔

اسی لیے تبلیغی جدوجہد میں مذاکرے کے دوران یہ زریں جملہ کہہ کر ''نماز ایسی بنانا ہے کہ اس سے ہمارے مسائل حل ہوں'' نماز میں اعلیٰ خشوع وخضوع پیدا کرنے پر مؤثر طریقہ سے آمادہ کیا جاتا ہے۔ بل کہ حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ نماز سے کام بننے پر تعجب نہیں نہ بننے پر تعجب ہے۔ (کہ نماز پڑھنے کے باوجود ہمارے کام نہیں بنتے!)

نماز کی اسی تاثیر (دنیا وآخرت کی کامیابی اور مسائل زندگی کے حل) کی وجہ سے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کو نماز سے اس قدر شغف تھا کہ انہوں نے اس کو امر تشریعی سے بڑھا کر امر تلذذی پر پہنچایا تھا۔ (یعنی اتنا ہی نہیں کہ نماز اس لیے پڑھنا ہے کہ وہ ایک شرعی حکم ہے بل کہ وہ

لذت ودلچسپی کا بھی سامان ہے، اسے دلچسپی کا ذریعہ بنانا ہے) چناں چہ حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں تو ان کا یہ قول بہت مشہور ہے فرماتے تھے کہ اگر مجھے جنت میں داخل ہونے اور دو رکعت نماز پڑھنے میں اختیار دیا جائے تو میں دو رکعت کو ہی اختیار کروں گا۔ کیوں کہ جنت میں داخل ہونے میں میری اپنی رضا ہے، اور نماز پڑھنے میں میرے مولیٰ کی رضا ہے۔ اور حضرت ملا علی قاریؒ نے اس طرح کا قول حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نقل کیا ہے کہ ''لَوْ خُیِّرْتُ بَیْنَ الْمَسْجِدِ وَالْجَنَّۃِ لَاخْتَرْتُ الْمَسْجِدَ'' (مرقات ۲/۲۱۴)۔

(۲) گناہوں سے نماز کے روکنے کی امتیازی تاثیر کی وضاحت

آیت شریفہ ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ'' کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ پر سوال یہ ہوتا ہے کہ ہم تو بہت سے نمازیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ نماز پڑھتے ہیں لیکن گناہوں سے باز نہیں آتے تو پھر آیت شریفہ کا کیا مطلب ہے؟ تو امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تفسیر میں مختلف جوابات روایات کی روشنی میں دیئے ہیں۔ لیکن پہلے امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ کیا فرماتے ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بڑی عمدہ بات لکھی ہے فرمایا: قرآن کریم کا ارشاد ہے'' اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ'' (العنکبوت ۴۵)۔ یعنی نماز آدمی کو تین بری چیزوں سے روکتی ہے۔ فحش سے، منکر سے، اور بغی سے۔ امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ بسملہ میں اور سورۂ فاتحہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○'' میں تین الفاظ ہیں ''اللہ، رحمن، رحیم''۔ یہ تینوں مبارک الفاظ ان تینوں یعنی فحش، منکر، بغی کا توڑ ہیں۔ وہ اس طرح کہ شیطان انسان کو تین راستوں سے گمراہ کرتا ہے۔ اول ھویٰ، دوم غضب، سوم خواہش نفس سے۔

اور اللہ تعالیٰ نے شیطان سے اپنے بندوں کی حفاظت فرماتے ہوئے فرمایا ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ'' کہ نماز آدمی کو ان تینوں راستوں سے بچاتی ہے کیوں کہ فحش سے خواہش نفس۔۔۔ منکر سے غضب۔۔۔ اور بغی سے ھویٰ۔۔۔ مراد ہے خواہش یعنی شہوت حیوانیت ہے۔۔۔ غضب درندگیت ہے۔۔۔ ہوی شیطانیت ہے۔۔۔ شہوت (حیوانیت) ایک آفت ہے لیکن غضب (درندگیت) اس سے بڑی آفت ہے اور غضب ایک آفت ہے لیکن ھویٰ (شیطانیت) اس سے بھی بڑی آفت ہے۔ کیوں کہ شہوت سے انسان اپنے پر ظالم ہوتا ہے۔۔۔ اور غضب سے دوسروں پر ظالم ہوتا ہے۔۔۔ اور ھوی سے اس کا ظلم متعدی ہوکر اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے اور اللہ پر ظالم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث شریف میں فرمایا ''الظلم ثلاثة۔۔۔''۔

اب توڑ کی بات سمجھیے

● بسم اللہ۔۔ میں لفظ ''اللہ'' جو اسم اعظم ہے اس پر ایمان لانا ھویٰ کو باطل کر دیتا ہے، لہٰذا لفظ اللہ ھویٰ کا توڑ ہوا، اور غضب کا توڑ رحمن ہے اور خواہش وشہوت کا توڑ رحیم ہے۔

● رحمن غضب کا توڑ اس طرح کہ رحم کا مقابل ظلم ہے جو غضب وغصہ سے پیدا ہوتا ہے اس کو رحمن کی رحمت ختم کر دیتی ہے جو رحمت عام ہے مومن وکافر پر۔

● رحیم خواہش کا توڑ اس طرح کہ آدمی کا اپنی خواہشات کی پیروی کرنا اپنے نفس پر ظلم ہے جس کو رحیم کی رحمت ختم کر دیتی ہے جو خاص ہے۔ ھویٰ کا توڑ اللہ ہے۔ ھویٰ کہتے ہیں الوہیت یعنی معبود ہونے کو مخلوق کے لیے ثابت کرنا[1]۔ (تفسیر کبیر ۲۶۶/۱ فصل ثانی فی مداخل الشیاطن۔ محمد عبد الرحمن قاہرہ طبع ثالث)۔

---

[1] حضرت امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نماز کے بارے میں جو آیت شریفہ پیش کی ہے اس میں ''وَالْبَغْیِ'' نہیں ہے ممکن ہے کہ آیت خطبہ (جس کا بیان اس سے پہلے گزرا ہے) سے تشابہ ہوا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ لہٰذا ان کے تحریر کے مطابق ہم نے نقل کر دیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ تمام گناہوں کے تین دروازے ہیں ہوی غضب شہوت اوران تینوں کا توڑ بسم اللہ الرحمن الرحیم میں ہے اور یہی تاثیر نماز کی بتائی گئی ہے کتنی عمدہ بات ہے اللہ تعالیٰ تمام گناہوں سے ہماری حفاظت فرمائیں اوران مبارک تینوں الفاظ اور نماز کی برکت سے سرفراز فرمائیں۔

ماقبل میں آیت شریفہ کے بارے میں اعتراض ذکر کیا تھا۔تو امام قرطبی کے نقل کردہ جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضرت حماد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اَلْعَبْدُ مَادَامَ فِی صَلوتِہٖ لَا یأْتِیْ فَحْشَاءَ وَلَا مُنْکَرًا اَیْ ان الصلاۃَ تَنْھٰی مَادُمْتَ فِیْھَا'' حضرت حمادؒ کا فرمان ہے کہ نماز کا گناہوں سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب تک نماز میں ہوگا تب تک وہ گناہوں سے روکے گی، اور ظاہر ہے بندہ جب تک نماز میں ہوتا ہے تو یقیناً گناہوں سے باز رہتا ہے۔

(۲) محققین کا پسندیدہ ہے اور صوفیہ اسی کے قائل ہیں اور مفسرین نے اسی کا ذکر زیادہ تر کیا ہے۔کہ نماز گناہوں سے روکتی ہے کا مطلب خود نمازی کو حکم ہے کہ تو ایسی نماز پڑھ جو ساری صفات مطلوبہ اور حدود کاملہ پر مشتمل ہو ''اَقِمِ الصَّلٰوۃَ۔۔۔'' اس حکم کے بعد قرآن نے اس نماز کی خبر دی ہے کہ اب یہ نماز گناہوں سے روکے گی۔اس کی تائید بھی اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال سے پیش کی ہے المختصر ۔

(۳) اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی ۔۔خبر ہے لیکن معنی میں امر ہے،مطلب اس کا یہ ہے کہ مصلی کو حکم ہے کہ تجھے گناہوں سے رکنا ہے، کیوں کہ بذات خود نماز روکنے والی نہیں وہ تو صرف اس کا ذریعہ ہے۔(قرطبی بیروت ۱۳/۷ ۳۴)۔

حضرت مولانا محمد سعد صاحب کاندھلہ دامت برکاتہم (مقیم حضرت نظام الدین بنگلہ والی مسجد) سے راقم الحروف نے روبرو ۱۹۹۶ء میں نظام الدین ہی میں ایک مجلس میں نماز بنانے کے بارے میں بہت عمدہ بات سنی تھی، آپ نے گناہوں سے بچانے کی نماز کی تاثیر معقول طریقہ سے سمجھائی تھی۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اچھی طرح سمجھا دیں اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

فرمایا تھا کہ حدیث شریف ''اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّه يَرَاكَ'' (مشکوٰۃ ۱۱)۔ میں احسان کے دو درجے بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ بندہ اس طرح نماز پڑھے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ حاصل نہ ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس خیال سے پڑھے کہ اللہ تعالیٰ تو اس کو دیکھ ہی رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا تھا حدیث شریف میں یہی دو درجے بیان ہوئے ہیں اس میں کوئی تیسرا درجہ (مثلاً اللہ تعالیٰ بھی دیکھ نہیں رہا ہے) مذکور نہیں لہٰذا بالفرض کوئی اس تیسرے حال کے مطابق یہ خیال دل میں لائے کہ نعوذ باللہ من ذلک کہ اللہ تعالیٰ بھی نہیں دیکھ رہے ہیں تو کفر کا ذریعہ ہوگا۔ اس لیے کم از کم دوسرا درجہ تو ضرور حاصل ہونا چاہیے۔

حضرت مولانا نے نماز کی گناہوں سے روکنے کی تاثیر کو اس طرح سمجھایا تھا کہ شریعت نے احسان (نماز) کے دو درجے تعلیم دے کر ہم سے گویا اس کا مطالبہ کیا کہ اس استحضار و کیفیت (خدا کو دیکھنا یا خدا کا ہم کو دیکھنا) کو لے کر بازاروں، ملازمتوں، گھروں اور اپنے اپنے کاروبار میں جاؤ۔ یعنی نماز کے اس احسان کو صرف نماز تک محدود نہیں رکھنا ہے، کیوں کہ نماز پر پوری زندگی کا مدار ہے وہ عماد الدین ہے جس کی اقامت پر پورے دین کی اقامت موقوف ہے، لہٰذا اس کیفیت کو خارج نماز بھی باقی رکھنا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جس شخص نے خارج نماز، نماز کی اس کیفیت کو باقی رکھا ہوگا وہ گناہ نہیں کرسکتا، اس کے برخلاف اگر کسی نے نماز چاہے خشوع وخضوع سے پڑھی ہولیکن احسان کا درجہ حاصل نہ کیا ہو یا اسے حاصل کیا ہولیکن خارج نماز باقی نہ رکھا ہوتو اس کی نماز گناہوں سے بچائے یہ ضروری نہیں۔

لیکن یہ تصور واستحضار خارج نماز دھیرے دھیرے مٹ سکتا ہے، لیکن اتنے وقت میں دوسری نماز کا وقت پھر آپہنچے گا اور دوبارہ نماز سے وہ کیفیت حاصل ہوجائے گی، پھر اس تازہ دم کیفیت سے کاروبار میں جائے گا علی ھذا القیاس۔ تو ظاہر ہے کہ وہ شخص ضرور گناہوں سے محفوظ رہے گا، بل کہ درمیان وقت میں اشراق وچاشت، اوابین وتہجد وغیرہ پڑھے گا پھر تو مکمل طریقے پر اس کو اس کی نماز مذکورہ طریقے کے مطابق گناہوں سے یقینی طور پر مانع ہوگی۔ تو اب مفہوم واضح ہوگیا کہ اچھی نماز ادا کرنے سے وہ گناہوں سے کیسے روکتی ہے؟

اور فرمایا اگر اچھی طرح نماز کو نہیں پڑھا تو گناہوں سے روکنا تو درکنار پچھلے گناہوں کی معافی کا ذریعہ بھی نہیں ہوگی۔ بل کہ اس کی نماز اس کو اللہ تعالیٰ سے مزید دور کردے گی۔

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ وابن عباس رضی اللہ عنہ والحسن رحمہ اللہ والاعمش رحمہ اللہ قولھم "مَنْ لَّمْ تَنْہَہٗ صَلَاتُہٗ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ لَمْ تَزِدْہُ مِنَ اللہِ اِلَّا بُعْدًا" (قرطبی ۱۳/۳۴۸)۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مذکورہ طریقے پر نماز بنانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اگر ائمہ حضرات اپنے اندر انقلاب لانا چاہتے ہیں تو اس طریقے پر نماز پڑھ کر دیکھ لیں، واقع میں یہ بہت مؤثر بات ہے۔

(۳) نماز میں خشوع وخضوع

آج ہماری نمازیں عادتوں اور شکلوں میں ڈھل چکی ہیں، نہ ظاہر میں خضوع نہ باطن میں خشوع۔ نماز کی حقیقت پیدا کرنے کی خوب ضرورت ہے، جب تک نماز کی حقیقت پیدا نہ

ہوگی، تب تک وہ مفتاح الجنۃ کیسے ہوگی، اور دنیوی مسائل کیسے حل ہوں گے؟ لہٰذا فقہی لحاظ سے بھی نماز کامل ہو کہ ایک ایک سنت اور ادب کو جان جان کر ادا کیا جائے اور احسان کے لحاظ سے بھی وہ کامل اور اعلیٰ درجہ کی ہو، اور نماز کے جتنے فضائل ہیں ان کے حصول کی نیت اور ان کا استحضار ہو، اور کامل درجہ کا اخلاص بھی ہو۔ گویا مسائل وفضائل، احسان واستخلاص چاروں چیزیں جمع ہوں۔

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے ''تم زمین کے نمک ہو اگر نمک ہی سے نمکینیت ختم ہوجائے تو کھانا کیسے نمکین بنایا جاسکتا ہے! بس اسی طرح نماز کی جان ہی خشوع وخضوع اور احسان واستخلاص ہے اگر یہی چیز نماز میں نہ ہو تو صرف شکل اور ڈھانچہ کے سوا کیا رہا، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ خشوع حاصل نہ ہو تو نماز چھوڑ دے، نہیں بل کہ وہ اس صورت میں بھی نماز باقی رکھے لیکن خشوع کے پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں ''اَصْلُ الْخُشُوْعِ هُوَ لِيْنُ الْقَلْبِ وَرِقَّتُهٗ وَسُكُوْنُهٗ وَخُضُوْعُهٗ وَحِرْقَتُهٗ، فَاِذَا خَشَعَ الْقَلْبُ تَبِعَهٗ جَمِيْعُ الْجَوَارِحِ وَالْاَعْضَاءِ لِاَنَّهَا تَابِعَةٌ لَّهٗ'' (الخشوع فی الصلوٰۃ ۲)۔ کہ خشوع کی حقیقت دل کا نرم ہونا، اس کا پسیجنا ہے، نیز وہ نام ہے اس کے سکون وجھکاؤ اور سوزش کا، اور قلب جب جھک پڑتا ہے تو سارے اعضاء وجوارح اس کی پیروی میں جھک پڑتے ہیں کیوں کہ یہ سب اس کے تابع ہیں۔

(۴) نماز بنانے کا ایک طریقہ

(۱) نماز بنانے میں اس کے مقدمہ کی بھی اہمیت ہے۔ حدیث شریف میں اس کے مقدمہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور وہ ہے احسان وضو یعنی اچھی طرح وضو کرنا اور مسجد جاتے ہوئے سکون ووقار اختیار کرنا۔ خلاصہ یہ کہ وضو کو سنن وآداب کی رعایت کرتے ہوئے، اس کی

دعاؤں کا لحاظ کرتے ہوئے کیا جائے، اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ میں احکم الحاکمین کے دربار میں جانے کی تیاری کرر ہا ہوں۔ پھر مسجد کو نکلے تو سکون وقار سے پست نگاہ سے جائے اور مسجد میں داخل ہونے کے وقت یہ خیال کرے کہ میں احکم الحاکمین کے دربار کے حرم میں داخل ہوا ہوں، اور سنت طریقے پر دعا پڑھتے ہوئے داخل ہو۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد نماز اچھی نہیں بن سکتی!!!

(۲) نماز شروع کرنے سے پہلے یہ خیال بھی کرلے کہ یہ آخری نماز ہے، دائیں طرف جنت، بائیں طرف جہنم ہے اور پل صراط پر کھڑا ہوں اور عرش مولی کے سامنے کھڑا ہوں۔ پھر دل کو ماسوا اللہ سے خالی کر کے پورے دھیان سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی کا خیال کر کے ''اللہ اکبر'' کہہ کر نماز شروع کرے، آپ کا کیا خیال ہے اس پر عمل کرتے ہوئے کیا نماز نہیں بن سکتی؟؟ ضرور بن سکتی ہے بس شرط یہ ہے کہ یہ چیز کتابوں سے نکل کر زندگیوں میں اور عمل میں آجائے۔

تکبیر تحریمہ کہنے میں جلدی نہ کرے چاہے رکعت فوت ہو جائے بل کہ اطمینان سے کہے۔ کیوں کہ تکبیر کو جتنا دھیان سے اور خدا کی عظمت سے کہا جائے گا اتنا اس کا اثر پوری نماز پر پڑے گا۔ اب یہ تصور کرے کہ میں اپنے سامنے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں، اور یہ یقین کرے کہ اس مولی کو راضی کرنے ہی میں میری کامیابی ہے جس کامیابی کی طرف بلایا گیا ہے۔ اور حتی الامکان کھجلانے سے کھانسی اور جماہی سے اور کپڑوں اور بالوں کو درست کرنے وغیرہ تمام غلط حرکتوں سے اپنے کو بچائے اور اس طرح سکون سے نماز ادا کرے جیسے کوئی لکڑی گاڑی ہوئی ہو کہ ذرا بھی حرکت نہ ہو۔

(۳) نیز نفل نمازوں کی نیت سے لمبی لمبی نمازوں کو پڑھنے کی مشق کی جائے جس سے مزید خشوع حاصل ہوگا۔ ان نمازوں میں رکوع وسجدوں کی تسبیحات کو دس دس بار دھیان جما کر پڑھی جائیں، اوران میں وہ دعائیں بھی معنیٰ کا خیال کرتے ہوئے پڑھی جائیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ مثلاً رکوع میں ''اَللّٰھُمَّ لَکَ رَکَعْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ لَکَ سَمْعِیْ وَبَصَرِیْ وَمُخِّیْ وَعَظْمِیْ وَعَصَبِیْ''(مشکوۃ ۷۷)۔ مزید امامت کی ذمہ داری میں دیکھ لیں۔

(۵) مقتدیوں کی نماز میں خضوع کی ایک تدبیر

ائمہ حضرات مقتدیوں کو نماز میں خشوع پیدا کرنے کی ذیل کی اچھی تدبیر سے آگاہ کریں۔

● ائمہ حضرات کو چاہیے کہ سورۃ فاتحہ کا اچھا ترجمہ معمولی سی تفسیر سے ان کو ذہن نشین کرادیں، پھر سورۃ فیل سے سورۃ ناس تک تمام سورتوں کا ترجمہ بھی مع ضروری وضاحت انہیں سمجھادیں۔ کیوں کہ عامۃ لوگ انہی سورتوں کو نماز میں پڑھتے ہیں۔ جب وہ ترجمہ جان لیں گے تو ان کا دھیان نماز میں لگے گا۔ خصوصاً مغرب وغیرہ جہری قراءت کی نمازوں میں جب سنیں گے تو اور زیادہ دھیان جمے گا۔

● نیز ثنا، تسبیحات وتکبیرات، درود ودعا کے تراجم ومطالب سکھائیں۔ تاکہ قیام کے علاوہ دوسرے ارکان میں بھی ان کا دھیان نماز سے نہ ہٹے۔

● اور خصوصاً عبادت کا مفہوم،

● ہر وقت پڑھی جانے والی بسم اللہ

● اورساتھ ہی التحیات یعنی تشہد کا ترجمہ اور اس کا وہ پس منظر بتادیں جس کو ہم اختصار کے ساتھ یہاں بیان کرتے ہیں۔

کیا آپ کواس پر کوئی تعجب نہیں ہورہا ہے کہ ایک مسلمان کواور وہ بھی نمازی ہوکر نماز جیسی اہم عبادت میں روزمرہ پڑھی جانے والی سورۂ فاتحہ اور دیگر سورتوں اور دعاؤں کا ترجمہ اسے معلوم نہیں ، باربار پڑھی جانے والی چیزوں کا مطلب معلوم نہیں اور نماز کو پوری غفلت سے پڑھے !!! یقیناً بہت ہی تعجب کی بات ہے ۔لہٰذا اس کا نظام بنا کر مقتدیوں کوضرور ذہن نشین کرائیں آپ کی امامت سے متقدیوں کو دینی فائدہ ضرور ہونا چاہیےاگر ایسا کیا تو ان کی نمازیں جاندار بنیں گی۔

(الف) عبادت کی حقیقت

حضرت شیخ ابرار احمد دہلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اِیَّاكَ نَعۡبُدُ'' ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔کہ محققین فرماتے ہیں کہ نظر اللہ کی ذات پر ہو عبادت پر نہ ہو ابلیس کی نظر اپنے عمل پر تھی اس لیے تباہ ہوا، محققین فرماتے ہیں عمل چھوڑا نہ جائے لیکن نظر عمل سے ہٹادی جائے۔

پھر لکھا ہے کہ صاحب کشاف لکھتے ہیں کہ ''اِیَّاكَ نَعۡبُدُ'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ مقصود ذاتِ حق ہیں ،صرف عبادت مقصود نہیں ۔اور عبادت کیا ہے؟ عبادت کی ساری روح حکم ماننا ہے بس وہ جو حکم دے وہی سر آنکھوں پر۔

چاہے وہ نماز پڑھنے کا حکم دے یا (مکروہ وقت میں) نماز چھوڑنے کا حکم دے۔ روزہ رکھنے کا حکم دے یا (عید کے دن) روزہ نہ رکھنے کا حکم دے۔مکارم اخلاق کا حکم دے یا انسانیت کے حقوق کا حکم دے۔خلاصہ یہ کہ وہ جو کہے بندہ اس کا پابند۔وہ کہے تو کھانا عبادت وہ

کہے تو بھوکا رہنا عبادت، وہ کہے تو نماز پڑھنا عبادت وہ کہے تو نماز چھوڑ نا عبادت، وہ سونے کو کہے تو سونا عبادت جاگنے کو کہے تو جاگنا عبادت وہ محبت رکھنے کو کہے تو محبت رکھنا عبادت وہ عداوت رکھنے کو کہے تو عداوت رکھنا عبادت۔ مطلب اس طرح مزاج اور ذہن بنایا گیا کہ دار ومدار اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہے نہ کہ اپنے جذبات پر۔ (فیض ابرار ۵۶/۴)۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ رسمی عبادات سے نکلے اور مذکورہ طریقے پر عبادت کا اپنا مزاج بنائے یہی اصل عبادت ہے جس کو عبدیت و بندگی کہتے ہیں۔

(ب) بسم اللہ کی برکت وتاثیر

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فرعون نے الوہیت کے دعویٰ سے پہلے محل تعمیر کیا اور اس کے باہر کے دروازے پر (بسم اللہ۔۔) لکھنے کا حکم دیا، جب الوہیت کا دعویٰ کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو دعوت دینے کے لیے اس کے پاس بھیجا لیکن اس نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت قبول نہیں کی تو فرمایا الٰہی کئی بار میں نے اس کو دعوت دی لیکن کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ شاید تم اس کی ہلاکت کا ارادہ کررہے ہو، تو سنو تم اس کے کفر کو تو دیکھ رہے ہو کہ اس کو ہلاک کیا جائے لیکن میں اس کی اس لکھائی (بسم اللہ) کو دیکھ رہا ہوں جو اس کے دروازے پر ہے۔

امام صاحب اس کے بعد نکتہ بیان فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ایک شخص کافر ہوکر اپنے باہر کے دروازے پر اس پاک کلمہ کو لکھنے سے ہلاکت سے محفوظ رہ سکتا ہے تو جو شخص عمر بھر اس پاک کلمہ کو اپنے دل پر لکھ رکھے تو اس کا کیا حال ہوگا! (تفسیر کبیر ۱۶۸/۱ الباب الحادی عشر)۔

ایک اور جگہ امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جس کو حضرت شیخ ابرار احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کی کشتی دس رجب سے لے کر عاشورہ دس محرم تک چلتی رہی

اور جودی پہاڑ پر جا کر ٹھہری ٦ ماہ کا عالمگیر طوفان تھا اور حضرت نوح علیہ السلام نے آدھی بسم اللہ پڑھی تھی قرآن کہتا ہے۔ ''وَقَالَ ارۡکَبُوۡا فِیۡهَا بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖیهَا وَمُرۡسٰها''۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ آدھی بسم اللہ کی برکت سے طوفان خیز موجوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی محفوظ رہی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس سفینہ کے ناخدا ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت قدم قدم پر پوری بسم اللہ پڑھتی ہو تو اس کی کشتی کیسے ڈوبے گی!

آپ نے شاعر کا مشہور شعر سنا ہوگا۔ (فیض ابرار ۳/۲۱۰)۔ شعر

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے	بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے

تو کسی نے کہا۔ شعر

آہ کیوں جائے فلک پر رحم لانے کے لیے	وہ یہیں موجود ہیں بگڑی بنانے کے لیے

(ج) التحیات کیا ہے؟

حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے علامہ سیوطی اور ابن حجر اور ابن ملک رحمہم اللہ تعالیٰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ شب معراج میں جب دربار الٰہی میں آپ کو حاضری کا شرف حاصل ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ان کلمات کے ذریعہ حمد وثنا کی ''اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالطَّیِّبَاتُ''۔ اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ یعنی تمام قولی عبادتیں (مثلاً زبان سے تسبیح وتکبیر اور حمد وثنا اور قراءت ودعا اور ذکر اللہ) سب اللہ کے لیے ہیں۔۔۔وَالصَّلٰوةُ تمام بدنی عبادتیں (مثلاً نماز وروزہ وغیرہ) سب اللہ کے لیے ہیں۔وَالطَّیِّبَاتُ تمام مالی عبادتیں (مثلاً زکوٰۃ وعشر اور نفلی صدقات اور حج وغیرہ سب کی) سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کلمات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تین طرح کی حمد ثنا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلے میں انعامات بھی تین طرح کے عطا فرمائے، فرمایا ''اَلسَّلَامُ

عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہ ''ایک تو سلامتی،،،دوسرا رحمت،،،اور تیسرا برکت۔ یہ تینوں انعامات تین قسم کی تعریفوں کے موافق عطا فرمائے۔ کیوں کہ قول وزبان کے لیے صداقت وسلامتی مطلوب ہے، اور بدن کے لیے رحمت وصحت مطلوب ہے اور مال کے لیے برکت مطلوب ہے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ رحمت خداوندی جوش میں ہے اور انعامات کی بارش ہورہی ہے لیکن یہ صرف مجھ ہی پر ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے۔'' اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِہِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ '' فرما کر تمام نیک بندوں کو بھی شامل فرمالیا کہ یہ سلامتی ''وغیرہ انعامات'' ہم پر اور اللہ تعالیٰ کے سب نیک بندوں پر بھی ہو۔

جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عاشق ومعشوق اور حبیب ومحبوب کے درمیان یہ راز ونیاز دیکھا کہ بس یہ دو ذاتیں سب سے بڑی ہیں ایک عطا کرنے والی اور ایک لینے والی ایک عابد ایک معبود۔ جن پر ایمان لائے بغیر ایمان قابل قبول نہیں ہوتا۔ تو کہہ اٹھے۔ ''اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ '' یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ (مرقات ۳۳۱/۳۳۰/۲)۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ تشہد تین عظیم ذات: اللہ تعالیٰ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ارشادات کا مجموعہ ہے۔ کس قدر عظمت پر مشتمل مجموعہ ہے اور یہ بھی محسوس کیا کہ وہ بلیغ مضامین پر مشتمل ہے!!! اگر اس کو ان مضامین کے استحضار کے ساتھ پڑھا جائے تو یقیناً خشوع میں اضافہ ہوگا۔ انصاف سے کہیے، ان سب کی رعایت کر کے نماز پڑھنے سے کیا نماز میں لطف نہیں آئے گا ؟!!۔ بل کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں

مسلمانوں کے لیے سلامتی کی دعا بھی ہے اور اپنے ایمانوں کی تجدید بھی کیوں کہ ہر مصلّی ''اَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الخ'' پڑھے گا تو اس کا ایمان متجدد ہوگا۔ (مرقات ۲/۳۳۶)۔اللہ اکبر: تجدیدایمان کا سامان بھی نماز میں ہے؟ حالاں کہ ہمیں اس کا احساس تک نہیں۔ ۱؎

یَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمۡ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیۡبِکَ خَیۡرِ الۡخَلۡقِ کُلِّھِمِ

۱؎ ائمہ حضرات مقتدی حضرات میں پہلے اس کا اعلان کریں کہ ہفتے میں دودن ان سورتوں، ثناء ودعا، اور تشہد وغیرہ کا ترجمہ ومطلب فلاں وقت میں سکھایا جائے گا۔ لہٰذا تمام مقتدی شرکت فرمائیں۔ جب ایک بار سب کا مطلب بتاچکیں تو دوبارہ بھی شروع رکھا جائے تا کہ غائبین کو موقع مل جائے اور حاضرین کو پختگی حاصل ہو۔ ائمہ حضرات سکھانے میں آسان سلیس زبان استعمال کریں صرف موٹی موٹی باتیں بتائیں اور دو دو یا تین تین بار بول کر مکتب کے بچوں کی طرح سکھائیں تقریر نہ کریں۔ سکھانے کے بعد جائزہ بھی لیں کہ کس نے کتنا سکھا۔

فصل پنجم: اتحاد واتفاق کی ذمہ داری

پڑھنے سے پہلے تھوڑی دیر ٹھہر جائیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہوکر دعا فرمالیں کہ اللہ تعالیٰ مسلم معاشروں کو اتحاد واتفاق کی مضبوط بنیادوں پر کھڑا فرمائیں۔ کیوں کہ آج مسلمان مختلف مذاہب اور مختلف خاندان و پارٹیوں میں ٹوٹے کانچ کے ٹکڑوں کی طرح بکھر چکے ہیں اور اپنی اتحادی طاقت کھو چکے ہیں۔ اس لیے ائمہ حضرات کو چاہیے کہ وہ اس پر خوب توجہ فرمائیں کہ مسلم معاشروں میں جو نااتفاقی ہے وہ کسی بھی قیمت پر دور ہو۔ چاہے وہ نااتفاقی خاندانی عداوت کی وجہ سے ہو یا (فی زماننا) مذہبی آراء کے اختلاف کی وجہ سے کیوں کہ دونوں ہی شدید گناہ ہیں۔ لہٰذا محنت کر کے ان کو ''اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' (مشکوٰۃ ۴۲۲) کا مصداق بنائیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اہل نظر وفکر سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس وقت دنیا کے ہر خطے اور ہر ملک میں مسلمان جن مصائب اور آفات میں مبتلا ہیں ان کا سب سے بڑا سبب ۔۔۔ آپس کا تفرقہ اور خانہ جنگی ۔۔۔ ہے۔ ورنہ عددی اکثریت اور مادی اسباب کے اعتبار سے پوری تاریخ اسلام میں کسی وقت بھی مسلمانوں کو اتنی عظیم طاقت حاصل نہیں تھی جتنی آج ہے۔

اس تفرقہ کے اسباب پر جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب اللہ تبارک وتعالیٰ سے اور آخرت کے دن سے غفلت اور دوسری قوموں کی طرح صرف دنیا کی چندروزہ مال ودولت اور عزت وجاہ کی بے لگام ہوس ہے۔ جو کبھی مذہبی اور دینی نظریات کی آڑ میں ہمارے لیے وہ ایک دوسرے کے خلاف اہانت واستہزاء کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ایمان واتحاد کی طاقت!!

حضرت مولانا اسلم شیخوپوری مدظلہ العالی صاحب فرماتے ہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمان متحد رہے، انہیں دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکی، مسلمانوں کو جب بھی شکست ہوئی آپس کی خانہ جنگیوں اور اختلافات کی وجہ سے ہوئی ہے۔

تمہاری قوم کی تو ہے ہی بِنا دین وایمان پر
تمہاری زندگی موقوف ہے تعمیل قرآن پر
تمہاری فتح یابی منحصر ہے فضل یزداں پر
نہ قوت پر نہ شکوت پر نہ کثرت پر نہ ساماں پر

چناں چہ جب تلک مسلمانوں میں اخوت ومحبت اور اتفاق واتحاد کا یہ رشتہ برقرار رہا، وہ ساری دنیا پر چھائے رہے اور جب سے انہوں نے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور ایک دوسرے کو گرانے کا عمل شروع کیا ہے، وہ اقوام عالم میں ذلیل وخوار ہوتے جارہے ہیں۔

افرادی اعتبار سے دیکھئے تو اس وقت مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے بھی زیادہ ہے، وسائل کے اعتبار سے دیکھئے تو پیٹرول جیسے سیال سونے کے کنویں زیادہ تر مسلمانوں کے قبضے میں ہیں، معدنیات کے ذخائر اور کانیں بھی اسلامی ممالک میں زیادہ ہیں، مالی اعتبار سے نظر ڈالیں تو اکثر اقوام عالم سے مسلمان قوم زیادہ مال دار ہے۔لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مسلمان کمزور اور مغلوب ہیں، آخر کیوں؟

اس کی بڑی وجہ ایمانی کمزوری اور آپس کے لڑائی اور جھگڑے ہیں۔ پہلے مسلمانوں کے پاس سونے چاندی کی دولت نہیں تھی، بل کہ ایمان کی دولت تھی۔ان کے پاس پیٹرول اور معدنیات کے ذخائر نہیں تھے، البتہ اللہ کی ذات پر یقین اور اعتماد کا عظیم ذخیرہ ان کے پاس

تھا۔ان کے پاس جدید اسلحہ اور ساز وسامان کی طاقت نہیں تھی،لیکن آپس کے اتفاق واتحاد کی قوت ان کے پاس تھی۔

وہ نہتے تین سو تیرہ تھے،مگر انہوں نے ایک ہزار مسلح اور تجربہ کار لشکر کو شکست دے دی ،اور ایسا بھی ہوا کہ مسلمان تین ہزار تھے اور انہوں نے دو لاکھ کے لشکر کو شکست دے دی۔آپ نے کبھی کسی دوسری قوم کی تاریخ میں سنا کہ اتنے چھوٹے سے لشکر نے اپنے سے چودہ گنا بڑے مسلح لشکر کو شکست دی ہو؟ مگر مسلمانو!تمہیں اپنی تاریخ پہ ناز بھی ہونا چاہیے اور سبق بھی حاصل کرنا چاہیے کہ جب تمہارے اندر اتفاق تھا تو تمہارے اکابر نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں شام کے میدانوں میں دو لاکھ رومیوں کو ان کے اپنے گھر میں جا کر شکست فاش دی۔

اللہ کے بندو! آج تمہاری کمزوری کی وجہ ساز وسامان کی کمی نہیں،تمہاری کمزوری کی وجہ توپ وتفنگ اور گولہ بارود کا فقدان نہیں۔تمہاری کمزوری کی وجہ تربیت یافتہ فوجوں کی قلت نہیں۔تمہاری کمزوری کی وجہ سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کا عدم حصول نہیں،تمہاری کمزوری کی وجہ مال ودولت اور سیم وزر کی قلت نہیں۔بل کہ تمہاری کمزوری کی وجہ ایمان ویقین اور اتفاق واتحاد کا فقدان ہے۔کفر کی بڑی بڑی طاقتیں صحابہ رضی اللہ عنہم سے ان کے ساز وسامان اور اسلحہ کی وجہ سے نہیں ڈرتی تھیں۔بل کہ ان کے یقین محکم اور بے مثال اتحاد کی وجہ سے ڈرتی تھیں جب مسلمانوں میں یہ چیز باقی نہ رہی تو ان کا رعب اور دبدبہ بھی باقی نہ رہا۔ (تحفۃ الائمۃ ۵۹۴)۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ایک مہینہ کے لیے اپنی قوم سے الگ ہو کر کوہِ طور پر عبادت میں مشغول ہونا چاہا تو ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا کر سب کو ہدایت کی کہ میرے پیچھے سب ان کی اطاعت کرنا تا کہ آپس

میں اختلاف ونزاع نہ پھوٹ پڑے۔۔۔ پھر آگے لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں جو گوسالہ پرستی کا فتنہ پھوٹا اور ان کے تین فرقے ہوگیے، حضرت ہارون علیہ السلام نے سب کو دعوت حق دی مگر ان میں سے کسی فرقے سے کلی اجتناب اور بیزاری اور علٰیحدگی کا اعلان موسیٰ علیہ السلام کے آنے تک نہیں کیا۔ اس پر جب موسیٰ علیہ السلام ناراض ہوئے تو انہوں نے یہی عذر پیش کیا کہ میں تشدد کرتا تو بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہوجاتے اور ان میں تفرقہ پھیل جاتا، ’’اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ‘‘ یعنی میں نے اس لیے کسی بھی فرقہ سے بیزاری کا شدت سے اظہار نہیں کیا کہ کہیں آپ واپس آکر مجھے یہ الزام نہ دیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا اور میری ہدایت کی پابندی نہیں کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان کے عذر کو غلط قرار نہیں دیا بل کہ صحیح تسلیم کر کے ان کے لیے دعا واستغفار کیا۔ اس سے یہ ہدایت نکلتی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ سے بچنے کے لیے وقتی طور پر اگر کسی برائی کے معاملہ میں نرمی برتی جائے تو درست ہے۔ واللہ اعلم (معارف القرآن ۱۰۹/۶)۔

اتفاق کی اہمیت

حضرت مولانا حاجی محمد شریف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **حضرت مفتی محمد شفیع صاحب** رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعی بڑا کمال تھا کہ صحیح مسلک سے ذرہ بھر نہ ہٹے اور کسی کی کبھی دل آزاری تک نہ کی۔ ایسا کرنا بڑا مشکل کام ہے پل صراط کی طرح نازک معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب حق بات ایسے پیارے عنوان سے فرماجاتے تھے کہ اختلافِ مسلک رکھنے والوں کو بھی ناگوار نہ گزرتا۔ حق پرستی وحق جوئی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی مخالف بھی ایسی بات کہتا کہ شرعًا معمولی بھی گنجائش ہوتی تو فورًا بلا تامل قبول فرمالیتے اور اپنی رائے پر اصرار نہ

فرماتے۔ بڑے دکھ سے فرمایا کرتے تھے کہ''اکابر دیوبند میں مختلف مشربوں کے نام سے جو تفریق پیدا ہوگئی ہے۔

دینی مقاصد کی بہتری کا تقاضا یہ ہے کہ اسے حتی الامکان مٹایا جائے۔ مذاق سلیم کو مثبت انداز میں پھیلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کسی مسلک کا نام لیے بغیر یوں بات کہنی چاہیے کہ ہمارے اکابر کا طرز یہ تھا ان کا مزاج و مذاق یہ تھا اور اسی کو ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔

فرمایا کرتے تھے: تخریب سے بچتے ہوئے، دوسرے مزاج و مذاق کے حضرات میں گھلا ملا جائے اور مناسب موقع پر انہیں اکابر کے صحیح مذاق کی دعوت دی جائے۔ صرف اس حیثیت سے کہ وہ ایسی تعبیر ہے، جسے ہمارے اکابر نے اوفق بالسنہ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ قدماء و اکابر اسی کے حامل تھے۔ اس طرح امید ہے کہ ان شاء اللہ رفتہ رفتہ ناخوش گوار تفرق ختم ہوگا اور مل جل کر خدمت دین کا جذبہ بیدار رہوگا۔

تفرق کے نقصانات

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں تجاوز عن الحدود کا نام تفرق ہے، جو جائز اختلاف رائے سے الگ ایک چیز ہے۔ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے۔'' وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا '' (آل عمران ۱۰۳)۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وصیت کا ذکر ہے جو تمام انبیاء سابقین کو کی گئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔''أَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ '' (الشوریٰ ۱۳)۔

امام تفسیر ابو العالیہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اقامت دین سے مراد اخلاص ہے اور'' لا تَتَفَرَّقُوْا '' کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں عداوت نہ کرو، بھائی بھائی بن کر رہو۔

اس وصیت کے بعد قرآن میں بنی اسرائیل کے تفرق کا بیان کر کے اہل اسلام کو متنبہ

کیا گیا ہے کہ وہ ان کے طریقہ پر نہ جائیں۔اس بارے میں ارشاد ہے۔ ’’ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنۢ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ‘‘(شوریٰ ۱۴)۔ان لوگوں نے اپنے پاس علم آ جانے کے بعد ہی اختلاف کیا اور وہ بھی باہمی ضد (و بحث) سے۔

حضرت ابوالعالیہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ لفظ ’’بَغْيًا بَيْنَهُمْ ‘‘میں ارشاد ہے کہ ایسے اختلاف کا عداوت اور جنگ وجدل تک پہنچنا کبھی دین کے سبب سے نہیں ہوتا بل کہ ’’بَغْياً عَلَى الدُّنْيَا وَمُلْكِهَا وَزُخْرُفِهَا وَزِيْنَتِهَا وَسُلْطَانِهَا ‘‘۔(جامع العلم ۸۴/۲)۔

یعنی یہ عداوت جب بھی غور کرو تو اس کا سبب دنیا۔۔۔حب مال۔۔۔یا حب جاہ ۔۔ہوتا ہے،جس کو نفس وشیطان خدمتِ دین کا عنوان دے کر مزین کر دیتا ہے۔ورنہ اس طرح کے مسائل میں اختلاف رائے کی حد وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ مثبت طور پر اپنے عمل کے لیے ایک جانب کو اصلح سمجھ کر اختیار کر لیں۔اور اس سے مختلف مسلک رکھنے والوں سے لڑتے نہ پھریں۔

جس طرح دنیا میں انسان جب بیمار ہوتا ہے اپنے معالجہ کے لیے کسی ایک حکیم یا ڈاکٹر کا انتخاب کر کے صرف اسی کے قول پر بھروسہ کرتا ہے اور اسی کی ہدایات پر عمل کرتا ہے،مگر دوسرے ڈاکٹروں کو برا بھلا کہتا نہیں پھرتا۔ایک مقدمہ آپ کسی ایک شخص کو وکیل بنا کر اس کے سپرد کر دیتے ہیں مگر دوسرے وکلاء سے نہیں لڑتے پھرتے،مجتہدانہ مختلف فیہ مسائل میں بھی ٹھیک یہی آپ کا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔(تحفۃ الائمۃ ۵۴۳)۔

ہمارے چند دوست تھے،وہ تبلیغی جماعت کے ساتھ ایک جگہ گئے،گشت پر نکلے تو چند مسلمانوں کو مسجد میں آنے کی دعوت دی،رمضان المبارک کا مہینہ تھا،غالباً ان ساتھیوں نے اپنے خطیب سے آٹھ اور بیس رکعت تراویح کا جھگڑا سنا ہوگا،انہوں نے ان تبلیغی دوستوں سے کہا:

ہم مسجد میں تو بعد میں چلیں گے پہلے ہمارے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کرو کہ تراویح آٹھ رکعت ہیں یا بیس، ان دوستوں نے بہت پیارا جواب دیا! کہنے لگے: بھائی جو بیس رکعتیں پڑھتے ہیں، وہ کچھ زیادہ پڑھ لیتے ہیں اور جو آٹھ رکعتیں پڑھتے ہیں وہ کچھ کم پڑھ لیتے ہیں، لیکن پڑھتے دونوں ہیں ہم آپس میں الجھنے اور وقت ضائع کرنے کے بجائے کیوں نہ ان بے نمازوں کے پاس چلیں جو نہ آٹھ پڑھتے ہیں نہ بیس پڑھتے ہیں، وہ تو سرے سے نماز ہی سے محروم ہیں۔

لاحاصل اختلاف

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کا اس سلسلہ میں ایک عبرت انگیز واقعہ لکھا ہے فرماتے ہیں:

قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ میں تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا، ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں، میں نے پوچھا: حضرت کیسے مزاج ہیں؟

کہا: ہاں ٹھیک ہی ہے، میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کردی! میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے، ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی۔

فرمایا: میں تمہیں صحیح کہتا ہوں، عمر ضائع کردی۔ میں نے عرض کیا، حضرت بات کیا ہے؟

فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدوکاش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کردیں، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مسائل کے دلائل

تلاش کریں، یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔

اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں، ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل اور دوسرے مسالک کے فقہاء رحمہ اللہ تعالیٰ جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطاء (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کردیں، اور دوسرے کے مسلک کو خطا محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں، اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔

پھر فرمایا: ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطاء، اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، دنیا میں بھی ہم، تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح یا یہ کہ یہ صحیح ہے، لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطاء ہو اور اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو، دنیا میں تو یہ ہے ہی قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا، آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی، برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ یہ تھے۔

اللہ تعالیٰ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کو رسوا کردے گا نہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو، نہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کو، نہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے

علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنھوں نے ہدایت کو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں، اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے صحیح کہا تھا یا شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس، یہ نہیں ہوگا۔

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا نہ برزخ میں اور نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کردی، اپنی قوت صرف کردی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرام علیہم السلام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی، آج یہ دعوت تو نہیں دی جارہی، یہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہورہی ہیں اور اپنے واغیار ان کے چہرے کو مسخ کررہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیے تھا وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آرہا ہے، شرک و بت پرستی چل رہی۔۔۔حرام وحلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فروعی بحثوں میں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یوں غمگیں بیٹھا ہوں اور محسوس کررہا ہوں کہ عمر ضائع کردی۔ (تحفۃ الائمۃ ۶۰۲)۔

جھگڑوں کے نتائج !!!

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں آج ہمارا معاشرہ جھگڑوں سے بھر گیا ہے، اس کی بے برکتی اور ظلمت پورے معاشرے میں اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ عبادتوں کے نور محسوس نہیں ہوتے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہورہے ہیں، کہیں

خاندانوں میں جھگڑے ہیں تو کہیں میاں بیوی میں جھگڑا ہے، کہیں دوستوں میں جھگڑا ہے، کہیں بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہے، کہیں رشتہ داروں میں جھگڑا ہے، کہیں مسجدوں میں جھگڑا ہے، آپس میں مقتدیوں میں جھگڑا ہے مقتدی اور امام میں جھگڑا۔۔۔اور تو اور علماء کرام کے درمیان آپس میں جھگڑے ہو رہے ہیں، اہل دین میں جھگڑے ہو رہے ہیں، جس کے نتیجے میں دین اور علم کا نور ختم ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک جھگڑا تو جسمانی ہوتا ہے، جس میں ہاتا پائی ہوتی ہے اور ایک جھگڑا پڑھے لکھوں کا اور علماء کا ہوتا ہے، وہ ہے مجادلہ ۔۔۔، مناظرہ۔۔۔، اور بحث ومباحثہ۔۔۔

ایک عالم نے ایک بات پیش کی۔ دوسرے نے اس کے خلاف بات کی۔ اس نے ایک دلیل دی۔ دوسرے نے اس کی دلیل کا رد لکھ دیا۔ سوال و جواب اور رد وقدح کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اس کو بھی بزرگوں نے کبھی پسند نہیں فرمایا، اس لیے کہ اس کی وجہ سے باطن کا نور زائل ہوجاتا ہے۔ چناں چہ یہی حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ’’اَلْمِراءُ یَذْھَبُ بِنُوْرِ الْعِلْم‘‘۔ (اوجز المسالک شرح موطا الامام مالک۔ ۱/۱۵)۔ ترجمہ: یعنی علمی جھگڑے علم کے نور کو زائل کردیتے ہیں۔

جھگڑے کس طرح ختم ہوں؟؟

اس سلسلے میں **شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب** مدظلہ العالی فرماتے ہیں: اب سوال یہ ہے کہ یہ جھگڑے کس طرح ختم ہوں؟ **حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی صاحب** رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک ملفوظ آپ حضرات کو سناتا ہوں، جو بڑا زریں اصول ہے، اگر انسان اس اصول پر عمل کرلے تو امید ہے کہ پچھتر (۷۵) فیصد جھگڑے تو وہیں ختم ہوجائیں، چناں چہ فرمایا کہ:

''ایک کام یہ کرلو کہ دنیا والوں سے امید باندھنا چھوڑ دو، جب امید چھوڑ دو گے تو ان شاء اللہ پھر دل میں کبھی بغض اور جھگڑے کا خیال نہیں آئے گا''۔ دوسرے لوگوں سے جو شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں، مثلاً یہ کہ فلاں شخص کو ایسا کرنا چاہیے تھا، اس نے نہیں کیا، جیسی میری عزت کرنی چاہیے تھی، اس نے ایسی عزت نہیں کی، جیسی میری خاطر مدارت کرنی چاہیے تھی، اس نے ویسی نہیں کی، یا فلاں شخص کے ساتھ میں نے فلاں احسان کیا تھا، اس نے اس کا بدلہ نہیں دیا وغیرہ وغیرہ۔

یہ شکایتیں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ دوسروں سے توقعات وابستہ کر رکھی ہیں، اور جب وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں تو اس کے نتیجے میں دل میں گرہ پڑ گئی کہ اس نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا، اور دل میں شکایات پیدا ہو گئیں۔ ایسے موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تمہیں کسی سے کوئی شکایت پیدا ہو جائے تو اس سے جا کر کہہ دو کہ مجھے تم سے یہ شکایت ہے، تمہاری یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی، مجھے بری لگی، پسند نہیں آئی، یہ کہہ کر اپنا دل صاف کر لو، لیکن آج کل بات کہہ کر دل صاف کرنے کا دستور ختم ہو گیا، بل کہ اب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو اور اس شکایت کو دل میں لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی اور موقع پر کوئی اور بات پیش آ گئی، ایک گرہ اور پڑ گئی۔

چناں چہ آہستہ آہستہ دل میں گرہیں پڑتی چلی جاتی ہیں، وہ پھر بغض کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، اور بغض کے نتیجے میں آپس میں دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے **حضرت تھانوی** رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جھگڑے کی جڑ اس طرح کاٹو کہ کسی سے کوئی توقع ہی مت رکھو۔ کیا مخلوق سے توقعات وابستہ کیے بیٹھے ہو کہ فلاں یہ دے دے گا، فلاں یہ کام کر دے گا۔ توقع تو صرف اس سے وابستہ کرو جو خالق اور مالک ہے، بل کہ دنیا والوں سے تو برائی کی توقع رکھو کہ ان سے تو ہمیشہ

برائی ہی ملے گی۔اور پھر برائی کی توقع رکھنے کے بعد اگر کبھی اچھائی مل جائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ! آپ کا شکر اور احسان ہے۔اگر برائی ملے تو پھر خیال کرلو کہ مجھے تو پہلے ہی برائی کی توقع تھی۔تو اب اس کے نتیجے میں دل میں شکایت اور بغض پیدا نہیں ہوگا اور پھر دشمنی بھی پیدا نہیں ہوگی۔نہ جھگڑا ہوگا۔لہٰذا کسی سے توقع ہی مت رکھو۔(اصلاحی خطبات ۱۵۱/۶)۔

حضرت ابودرداء، حضرت ابوامامہ، حضرت واثلہ بن اسقع اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا کہ:

"خَرَجَ عَلَيۡنَا رَسُوۡلُ اللهِ ﷺ يَوۡمًا وَنَحۡنُ نَتَمَارٰى فِيۡ شَيۡءٍ مِنۡ اَمۡرِ الدِّيۡنِ فَغَضِبَ غَضَبًا شَدِيۡدًا لَمۡ يَغۡضَبۡ مِثۡلَه ثُمَّ انۡتَهَرَنَا فَقَالَ: مَهۡلًا يَا اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اِنَّمَا هَلَكَ مَنۡ كَانَ قَبۡلَكُمۡ بِهٰذَا۔ (۱) ذَرُوا الۡمِرَاءَ لِقِلَّةِ خَيۡرِهٖ، (۲) ذَرُوا الۡمِرَاءَ فَاِنَّ الۡمُؤۡمِنَ لَا يُمَارِيۡ، (۳) ذَرُوا الۡمِرَاءَ، فَاِنَّ الۡمُمَارِيۡ قَدۡ تَمَّتۡ خَسَارَتُه، (۴) ذَرُوا الۡمِرَاءَ فَكَفٰى اِثۡمًا اَنۡ لَّا تَزَالَ مُمَارِيًا، (۵) ذَرُوا الۡمِرَاءَ فَاِنَّ الۡمُمَارِيۡ لَا اَشۡفَعُ لَه يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ، (۶) ذَرُوا الۡمِرَاءَ فَاَنَا زَعِيۡمٌ بِثَلَاثَةِ اَبۡيَاتٍ فِي الۡجَنَّةِ فِيۡ رُبَاضِهَا، اَيۡ اَسۡفَلِهَا ۔وَ اَوۡسَطِهَا وَاَعۡلَاهَا لِمَنۡ تَرَكَ الۡمِرَاءَ وَهُوَ صَادِقٌ، (۷) ذَرُوا الۡمِرَاءَ فَاِنَّ اَوَّلَ مَا نَهَانِيۡ عَنۡهُ رَبِّيۡ بَعۡدَ عِبَادَةِ الۡاَوۡثَانِ وَشُرۡبِ الۡخَمۡرِ۔"۔(مجمع الزوائد ۲۰۹/۱)۔

ترجمہ : ایک مرتبہ ہم باہم دین کے ایک معاملہ میں الجھ رہے تھے اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا تو آپ ایسے غضب ناک ہو رہے تھے کہ اس سے پہلے ہم نے آپ کو کبھی اس طرح غضب ناک ہوتے نہیں دیکھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ڈانٹا پھر فرمایا: اسے چھوڑو اے امت محمدیہ! تم سے پہلے والے اسی سبب سے ہلاک ہوئے۔(۱) جھگڑے کو چھوڑو اس میں بہتری کم ہے۔(۲) جھگڑے کو چھوڑو کیوں کہ مؤمن لڑاکو نہیں ہے۔(۳) نزاع کو

چھوڑ دو کیوں کہ نزاع کرنے والا ہمیشہ نقصان میں ہوتا ہے۔(۴) جھگڑے کو چھوڑ دو کیوں کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جو جھگڑنے والے کے ساتھ ہمیشہ رہتا ہے۔(۵) جھگڑے کو چھوڑ دو کیوں کہ جھگڑنے والے کی قیامت کے دن شفاعت نہیں ہوگی۔(۶) جھگڑے کو چھوڑ دو کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے بھی جھگڑا چھوڑ دے تو میں اس کو جنت کے باغات کے تین درجہ کے محلوں کی ضمانت دیتا ہوں۔ ادنی (زمینی)، درمیانی اور اعلیٰ کی۔(۷) جھگڑے کو چھوڑ دو کیوں کہ میرے رب نے سب سے پہلے جس گناہ سے روکا ہے وہ شرک اور شراب پینے کے بعد جھگڑے کے گناہ سے روکا ہے۔" (تحفۃ الائمۃ ۶۲۶)۔

جھگڑے سے بچنے میں اکابرین کا طرز عمل

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کی پوری زندگی میں مذکورہ بالا حدیث پر عمل کرنے کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ جھگڑا ختم کرنے کی خاطر بڑے سے بڑا حق چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ ان کا ایک واقعہ سناتا ہوں، جس پر آج لوگوں کو یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ۔یہ دار العلوم جو اس وقت کورنگی میں قائم ہے۔ پہلے نانک واڑہ میں ایک چھوٹی سی عمارت میں قائم تھا، جب کام زیادہ ہوا تو اس کے لیے وہ جگہ تنگ پڑ گئی، وسیع اور کشادہ جگہ کی ضرورت تھی۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کی ایسی مدد ہوئی کہ بالکل شہر کے وسط میں حکومت کی طرف سے ایک بہت بڑی اور کشادہ جگہ مل گئی۔

جہاں آج کل اسلامیہ کالج قائم ہے۔ جہاں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مزار بھی ہے۔ یہ کشادہ جگہ دار العلوم کراچی کے نام الاٹ ہوگئی، اس زمین کے کاغذات مل گئے۔ قبضہ مل گیا، اور ایک کمرہ بھی بنا دیا گیا، ٹیلیفون بھی لگ گیا، اس کے بعد دار العلوم کا سنگ

بنیاد رکھتے وقت ایک جلسۂ تاسیس منعقد ہوا، جس میں پورے پاکستان کے بڑے بڑے علماء کرام اور تمام اسلامی ممالک کے سفراء حضرات تشریف لائے۔

اس جلسہ کے موقع پر کچھ حضرات نے جھگڑا کھڑا کر دیا کہ یہ جگہ دار العلوم کو نہیں ملنی چاہیے تھی، بل کہ فلاں کو ملنی چاہیے تھی، اتفاق سے جھگڑے میں ان لوگوں نے ایسی بزرگ ہستیوں کو بھی شامل کرلیا، جو حضرت والد صاحب کے لیے باعث احترام تھیں۔ والد صاحب نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ یہ جھگڑا کسی طرح ختم ہوجائے، لیکن وہ ختم نہیں ہوا۔ والد صاحب نے یہ سوچا کہ جس مدرسے کا آغاز ہی جھگڑے سے ہورہا ہے، تو اس مدرسے میں کیا برکت ہوگی؟

چناں چہ والد صاحب نے اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ میں اس زمین کو چھوڑ تا ہوں مجھے اس میں برکت نظر نہیں آتی۔ دار العلوم کی مجلس منتظمہ نے یہ فیصلہ سنا تو انہوں نے حضرت والد صاحب سے کہا: حضرت! یہ آپ کیسا فیصلہ کر رہے ہیں؟ اتنی بڑی زمین، وہ بھی شہر کے وسط میں، ایسی زمین ملنا بھی مشکل ہے۔ اب جب کہ یہ زمین آپ کو مل چکی ہے۔ آپ کا اس پر قبضہ ہے۔ آپ ایسی زمین کو چھوڑ کر الگ ہورہے ہیں؟

حضرت والد صاحب نے جواب میں فرمایا: میں مجلس منتظمہ کو اس زمین کے چھوڑنے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس لیے کہ مجلس منتظمہ درحقیقت اس زمین کی مالک ہوچکی ہے۔ آپ حضرات! اگر چاہیں تو مدرسہ بنالیں۔ میں اس میں شمولیت اختیار نہیں کروں گا، اس لیے کہ جس مدرسے کی بنیاد جھگڑے پر رکھی جارہی ہو، اس مدرسے میں مجھے برکت نظر نہیں آتی۔ پھر حدیث سنائی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے میں اس کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔ (ابوداؤد ۲/۳۰۵)۔

آپ حضرات یہ کہہ رہے ہیں کہ شہر کے بیچوں بیچ ایسی زمین کہاں ملے گی، لیکن سرکار

دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے ہیں کہ میں اس کو جنت کے بیچ میں گھر دلواؤں گا۔

یہ کہہ کر اس زمین کو چھوڑ دیا۔ آج کے دور میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ کوئی شخص اس طرح جھگڑے کی وجہ سے اتنی بڑی زمین چھوڑ دے، لیکن جس شخص کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر کامل یقین ہے، وہی یہ کام کرسکتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ چند ہی مہینوں کے بعد اس زمین سے کئی گنا بڑی زمین عطا فرمادی، جہاں آج دارالعلوم قائم ہے۔ یہ تو میں نے آپ حضرات کے سامنے ایک مثال بیان کی۔ ورنہ حضرت والد صاحب کو ہم نے ساری زندگی حتی الامکان اس حدیث پر عمل کرتے دیکھا۔ ہاں البتہ جس جگہ دوسرا شخص جھگڑے کے اندر پھنسا ہی لے، اور دفاع کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو وہ الگ بات ہے۔ ہم لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں کہ فلاں موقع پر فلاں شخص نے یہ بات کہی تھی، فلاں نے ایسا کیا تھا۔ اب ہمیشہ کے لیے اس کو دل میں بٹھالیا اور جھگڑا کھڑا ہوگیا۔

آج ہمارے پورے معاشرے کو اس چیز نے تباہ کردیا ہے۔ یہ جھگڑا انسان کے دین کو مونڈ دیتا ہے، اور انسان کے باطن کو تباہ کردیتا ہے۔ اس لیے خدا کے لیے آپس کے جھگڑوں کو ختم کردو، اور اگر دو مسلمان بھائیوں میں جھگڑا دیکھو تو ان کے درمیان صلح کرانے کی پوری کوشش کرو۔ (اصلاحی خطبات ۶/۱۵۳)۔

امت کی پریشانی کا علاج

حضرت اقدس مولانا محمد یوسف بنوری نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ کا ماہنامہ ''بینات'' کراچی کے لیے تحریر کردہ ایک فکر انگیز اداریہ ہے جو آپ نے پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد تحریر فرمایا تھا۔

چناں چہ آپ فرماتے ہیں:

تمام امت اسلامیہ کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے، ہر جگہ اضطراب ہے۔ نہ حکمرانوں کو چین نصیب ہے، نہ محکوم آرام کی نیند سو سکتے ہیں، مصیبت یہ کہ کوئی بھی صحیح علاج نہیں سوچ رہا ہے، جو زہر ہے اس کو تریاق سمجھ لیا گیا ہے، جو تباہی و بربادی کا راستہ ہے اس کو نجات کا راستہ سمجھا جا رہا ہے، جو تدبیریں شقاوت کو دعوت دے رہی ہیں، ان ہی کو ذریعہ سعادت خیال کیا جا رہا ہے۔ ماسکو ہو یا واشنگٹن، تمام جہنم کے راستے ہیں، کوئی بھی سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ کا راستہ جو سراسر نجات وسعادت کا اعلیٰ ترین وسیلہ ہے نہیں سوچ رہا ہے، جو صراط مستقیم جنت کو جا رہا ہے، اس سے بھٹک گئے ہیں، نہ معلوم کہ ارباب عقول کی عقلیں کہاں چلی گئیں؟

ارباب فکر آخرت سے کیوں عاری ہو گئے، آخر تاریخ کی یہ عبرتیں کس کے لیے ہیں؟ حقائق سے کیوں چشم پوشی کی جا رہی ہے؟ خاکم بدہن ایسا تو نہیں کہ تکوینی طور پر امت پر تباہی وبربادی کی مہر لگ چکی ہے؟ اس امت کا زوال مقرر ہو چکا ہے؟ عروج کا دور ختم ہو گیا ہے؟ حق تعالیٰ نے تو اسلام اور صرف اسلام کی نعمت کو آخری نعمت فرمایا تھا اور یہ صاف اور صریح اعلان ہو چکا تھا کہ اس کے سوا کوئی رشتہ ورابطہ، کوئی دین ومسلک قابل قبول نہ ہوگا، نجات اسی دین اور اسلام میں ہے اور اسی دینی رابطہ میں فلاح وسعادت ہے، باقی تمام راستے شقاوت وہلاکت اور تباہی وبربادی کے راستے ہیں اور یہ ابدی اعلان آج بھی حق تعالیٰ کے آخری پیغام میں کیا جا رہا ہے کہ: ’’ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ‘‘ (آل عمران ۸۵)۔ ترجمہ : اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو چاہے تو اسے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور سورۂ عصر میں تاریخ عالم کو گواہ بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ جن لوگوں میں ایمان باللہ، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، یہ چار باتیں نہیں ہوں گی، ان کا انجام تباہی وبربادی ہے۔

گزشتہ چند سالوں کے تجربات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جو طریقہ علاج کا سوچا

گیا اور عملاً اس کو اختیار بھی کیا گیا، وہ صحیح قدم نہ تھا، اخبارات بھی جاری کیے گئے۔۔۔، جلوس بھی نکالے گئے۔۔۔، مظاہرے بھی کیے گئے۔۔۔ جھنڈے بھی اٹھائے گئے۔۔، نعرے بھی لگائے گئے۔۔۔، الیکشن بھی لڑے گئے۔۔۔، کچھ تجویزیں بھی پاس ہوئیں۔۔۔، لیکن یہ سب نقار خانے میں طوطے کی آوازیں بن کر رہ گئے۔ قوم سے چندے کیے گئے کروڑوں روپے خرچ بھی کیے، لیکن قوم جہاں تھی کاش وہیں رہتی، ہزاروں میل پیچھے ہٹ گئی، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تدابیر اختیار نہ کی جائیں اور یہ بالکل عبث اور ضیاع وقت ہے، لیکن اتنا تو واضح ہو گیا کہ یہ پورا علاج نہیں اور یہ نسخہ مفید ثابت نہ ہوا، مرض کا ازالہ اس سے نہیں ہو سکا۔

اللہ تعالیٰ کی اس مخلوق کو بھولا ہوا سبق یاد دلائیں اور انبیاء کرام اور مصلحین امت کے طریقوں پر آسمانی ہدایات کی روشنی میں اصلاح کا بیڑا اٹھائیں اور اپنی پوری طاقت انفرادی واجتماعی اصلاح امت پر خرچ کریں، گھر گھر بستی بستی پہنچ کر ''دعوت الی الخیر'' کا ربانی پیغام پہنچائیں، اجتماعات ہوں تو اسی مقصد کے لیے، جلسے اگر ہوں تو اسی بنیاد پر، رسائل ہوں تو اسی کام کے لیے اخبارات کے صفحات ہوں تو اسی مقصد کے لیے اور کاش! اگر حکومت کے وسائل حاصل ہوں اور ریڈیو وغیرہ کی پوری طاقت بھی اس پر خرچ ہو تو چند مہینوں میں یہ فضا تبدیل ہو سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس وقت دین کی اہم ترین پکار یہی ہے کہ اللہ کے لیے اٹھو۔۔۔ اور خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ۔۔۔ اور سفینۂ حیات کو ساحل مراد تک پہنچانے کی پوری جدوجہد کرو۔

خدارا یہ جو آگ لگ چکی ہے جلد سے جلد بجھانے کی کوشش کرو۔ ورنہ تمام قوم وملک اس کے شعلوں کی نذر ہو جائے گا۔ افسوس وتعجب سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر کسی کے گھر میں آگ لگ جاتی ہے تو وہ اسے فوراً بجھانے کی تدبیر میں لگ جاتا ہے، کوئی کوتاہی نہیں کرتا، لیکن دین اسلام

کے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے، صدیوں کا جمع کیا ہوا ذخیرہ نذر آتش ہونے کے قریب ہے لیکن ہم اطمینان سے بیٹھ کر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

ہم علماء سے طلباء سے حکام سے صحافیوں سے وکلاء سے، کسانوں سے، مزدوروں سے، اور ہر ادنیٰ واعلیٰ سے خدا کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ اگر اس ملک کے اور خود اپنی زندگی کے کچھ دن اور مطلوب ہیں، اگر ہمارے دل پتھر، ہمارے ذہن مفلوج، ہمارے دماغ ماؤف اور ہمارے اعضاء شل نہیں ہو گئے ہیں۔

اور ہمارے بدن میں زندگی کی کوئی رمق اور ہماری آنکھ میں عبرت وغیرت کا کچھ پانی ابھی موجود ہے تو سارے دھندے چھوڑ کر، سارے کام ملتوی کر کے اور سارے مشاغل سے ہٹ کر چند دن کے لیے دعوت الی اللہ کا کام کرنا ہوگا، اس کے لیے سب کو نکلنا ہوگا، سب کے پاس جانا ہوگا، در بدر کی ٹھوکریں کھانی ہوں گی۔

اگر ملک کا معتد بہ حصہ اس فرض کو انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا تو حق تعالیٰ شانہ اس ملک کی اور اس کے ساتھ ہماری بقاء کا فیصلہ فرما دیں گے اور پھر بھارت اور روس بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور اگر ہم بدستور اپنی اپنی لے میں مست اور اپنے اپنے کام میں مگن رہے اور۔۔۔ دعوت الی اللہ کے کام کے لیے۔۔۔ اپنے اوقات،،،،، اپنے مال،،،،، اور اپنی جان،،،،، کو خرچ کرنے کی ہمت نہ کی تو خدا ہی جانتا ہے کہ اس فرض ناشناسی کی پاداش کن کن شکلوں میں ظاہر ہوگی، ہماری تدبیریں،،،،، ہماری حکومتیں،،،،، ہماری اسمبلیاں،،،،، ہمارے وسائل،،،،، خدا کے فیصلے کو نہیں بدل سکتے۔

میٹنگیں بلانے۔۔۔، عمائدین کو جمع کرنے۔۔۔، اتحاد کے نعرے لگانے۔۔۔ اور مشترکہ لائحہ عمل تیار کرنے۔۔۔ پر بہت وقت ضائع کیا جا چکا ہے۔ اب وقت ہمیں ایک لمحہ کی

مہلت دینے کو تیار نہیں۔ نہ دعوت واصلاح کے خاکے مرتب کرنے پر مزید اضاعت وقت کی ضرورت ہے۔۔۔حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ والی تبلیغی تحریک ہی۔۔۔بس امید کی آخری کرن ہے، اپنے ذوق، اپنے تقاضوں اور اپنے اختلافات کو ایک طرف رکھ دیجیے، ملت کی شکستہ کشتی کے ٹوٹے ہوئے اس تختہ کو، جس پر سات کروڑ نفوس سوار ہیں، اگر بچانا ہے تو بس یہی ایک تدبیر ہے کہ ہم سب۔۔۔اخلاص کے ساتھ۔۔۔اس کام کو کریں۔۔۔اور سیکھیں۔۔۔ہم ایک بار علماء اور دانشور طبقہ سے عرض کریں گے کہ خدارا مقتضائے حال کو سمجھو۔

ہمارے موجودہ مشاغل ہمارے پاؤں کی زنجیر بن جائیں گے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لیے۔۔۔دعوت واصلاح کی محنت والا کام نہ سنبھالا گیا۔۔۔اور ہماری بے التفاتی، لاپرواہی اور بے اعتنائی کی یہی کیفیت رہی جو اب تک ہے تو وقت کا فیصلہ بڑا ہی شدید اور بھیانک ہوگا۔ مشرق (سابقہ مشرقی پاکستان) والوں کو اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور ہمیں اسی سے عبرت پکڑ لینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں اور ملت بیضاء کی حفاظت کی توفیق امت کو نصیب فرمائیں۔ (تحفۃ الائمۃ ۵۴۵ از رسالہ ختم نبوت ۱۲ تا ۱۸ جولائی ۲۰۰۲ء)۔

اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، ہمارے گناہوں کو معاف فرمائیں اور پوری امت کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)۔

ہر دینی کام کرنے والے کو اپنا شریک کار سمجھیں

ہماری دینی جماعتیں جو تعلیم دین یا ارشاد و تلقین یا دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کے لیے قائم ہیں اور اپنی اپنی جگہ مفید خدمات بھی انجام دے رہی ہیں ان میں بہت سے علماء و صلحاء اور مخلصین کام کر رہے ہیں اگر یہی متحد ہو کر تقسیم کار کے ذریعہ دین میں پیدا ہونے والے تمام رخنوں کے انسداد کی فکر اور امکانی حد تک باہم تعاون کرنے لگیں اور اقامتِ دین کے مشترک

مقصد کی خاطر ہر جماعت دوسری کو اپنا دست و باز و سمجھے اور دوسروں کے کام کی ایسی ہی قدر کریں جیسی اپنے کام کی کرتے ہیں تو یہ مختلف جماعتیں اپنے نظام میں الگ رہتے ہوئے بھی اسلام کی ایک عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں اور تقسیم عمل کے ذریعہ اکثر دینی ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہیں۔

شخصی جھگڑوں کا علاج

جب دو شخص یا دو خاندان یا دو فریق میں معاملات اور ذاتی حقوق وغیر کے ناتے جھگڑا ہو جس کی اصل بنیاد خواہشات کی پیروی ہے تو اس میں دفع شر اور جھگڑے کو ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ سمجھدار شخص یا فریق اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔ ایسے شخص کی دنیا میں بھی عزت بڑھ جائے گی اور جو حق چھوڑا ہے وہ بھی امید قوی ہے کہ دوسرے راستوں سے حاصل ہو جائے گا اور آخرت میں تو ایسے بدلہ کی بشارت ہے کہ جس کا بدل دنیوی ساری سلطنتیں بن نہیں سکتیں۔

قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے یہ ایک قسم کا عذاب ہے۔ جس کا ذکر قرآن شریف کی سورۂ انعام کی آیت نمبر ۶۵ میں ہوا ہے۔ جس میں تین قسم کے عذاب الٰہی کا ذکر ہے اس میں تیسری قسم کا عذاب اس طرح کے جھگڑوں کے متعلق ہے۔ سوچئے وہ قوم جس کا شعار غیروں سے بھی عفو و درگزر اور ایثار تھا اور جھگڑے سے بچنے کے لیے اپنے بڑے سے بڑے حق کو چھوڑ دیتی تھی آج اس کے بہت سے افراد ذرا سی اور حقیر سی خواہش کے پیچھے بڑے سے بڑے تعلقات کو قربان کر دیتے ہیں۔ اغراض و ہوا کا یہ وہ اختلاف ہے جو قوم و ملت کے لیے منحوس اور دنیا کا نقد عذاب ہے۔

جب کسی بھی طرح کا جھگڑا چھڑ جائے تو اس کے ختم کے لیے سب سے پہلے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ’’ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ

الصَّابِرِینَ ‘‘۔ (انفال ۴۶)۔ آپس میں نزاع نہ کرو۔ ورنہ تم بزدل ہوجاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو۔ اس میں باہمی نزاع کے دو نتائج بیان کئے ہیں۔ ایک ذاتی طور پر کمزور وبزدل ہوجانا۔ دوسرا ہوا کا اکھڑ جانا اور دشمن کی نظر میں حقیر ہوجانا۔ پھر اس کے بعد فرمایا صبر کو لازم پکڑو۔ یہ صبر جھگڑوں سے بچنے کا ایک کامیاب نسخہ ہے۔

کوئی جماعت کتنی ہی متحد الخیال اور متحد المقصد کیوں نہ ہو۔ مگر چوں کہ انسانی طبیعتیں اور اس کی ضروریات مختلف ہوا کرتی ہیں اس لیے دوسروں کے ساتھ رہتے، چلتے خلاف طبع امور کا پیش آنا یقینی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ آدمی خلاف طبع امور پر صبر کرنے اور نظر انداز کرنے کا فن سیکھ لے ایسا کہ اپنی رائے پر اتنا جماؤ اور اصرار نہ ہو کہ اس کو قبول نہ کیا جائے تو لڑ بیٹھے اسی صفت کا دوسرا نام صبر ہے ۔ آدمی کو دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قدرت نہیں ہوتی مگر خود کو تو دوسرے کی بات مان لینے کی اور اگر نہ مانے تو کم از کم نزاع سے بچنے کے لیے خاموشی اختیار کر لینے کی قدرت تو ہوتی ہے ۔ اسی لیے قرآن کریم نے نزاع سے بچنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ ہر فرد و جماعت کو صبر کی تلقین کر دی تا کہ نزاع سے بچنا عملی دنیا میں آسان ہوجائے۔

(معارف القرآن ۲۵۲/۴)۔

دوسروں سے نہ لڑنے کے لیے پہلے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے، لوگ چوں کہ اپنے آپ سے لڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اس لیے ہمیشہ ان کی دوسروں سے لڑائی ختم نہیں ہوتی۔ اتحاد واتفاق کی قیمت اتنی سستی اور عام ہے کہ ہر شخص، مرد ہو یا عورت، عالم ہو یا جاہل اتحاد کو خرید سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو دبائے، شکایت وتلخی کو برداشت کر لے، اپنے مفاد کی بربادی پر راضی ہوجائے، دوسروں کی ترقی پر خوش رہنے کا حوصلہ پیدا کر لے اور فخر وتکبر کے جذبات کو تواضع میں تبدیل کر لے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اختلاف کو ختم کر کے اتحاد قائم

نہیں کیا جاتا، ایسا کم ہی ممکن ہے کہ اختلافات مٹ جائیں اور پھر اتحاد قائم ہو بل کہ اتحاد صرف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کچھ لوگ اپنے اختلاف کو صبر کے خانے میں ڈالنے پر راضی ہوجائیں، کسی سے اختلاف، جھگڑا ختم کرنا چاہیں تو صبر وحکمت اور اعراض کا سہارا ضرور لینا ہوگا۔ شخصی مفاد اور وقتی جذبات سے اوپر اٹھنے کی قربانی دینی ہوگی اور اتحاد کے خاطر ہرنا گواری کو گوارہ کرنا ہوگا۔

ان ائمہ حضرات کو جو پنج وقتہ اور جمعہ کی جماعتوں کی ذمہ دار ہیں (جن کو شریعت نے اس لیے مشروع کیا ہے تا کہ قوم میں اتحاد واتفاق پیدا ہو۔ جس کو حصہ اول میں بیان کیا ہے) چاہیے کہ قوم سے نزاع واختلاف کو اور نا اتفاقی کو حکمت سے دور کریں اور ان میں حقیقی اتحاد پیدا کریں۔ اور بقول حضرت **مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی** رحمہ اللہ تعالیٰ ایسا احساس اخوت پیدا کریں کہ اگر کسی کو ایک محلہ میں چھینک آجائے اور الحمد اللہ کہے تو یرحمک اللہ کی صدا دوسرے محلہ میں سنائی دے۔ نمازوں کی جماعتوں کا اور جمعہ وعیدین کی جماعتوں کا خاص مقصد ہی اتحاد واتفاق پیدا کرنا ہے برسوں باجماعت نمازوں کو پڑھنے کے بعد بھی یہ مقصد حاصل نہ ہو تو کس قدر افسوس اور رونے کی بات ہے!! اللہ تعالیٰ ہم سب کے لیے آسان فرمائیں اور ہم سب کی محنت وکوشش کو قبول فرمائیں۔

يَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلَى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

باسم الفتاح العلیم ۔ وَجَعَلْنَا مِنْھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

ائمہ مساجد کے لیے :	علمی	فکری	تربیتی	اصلاحی	بیش بہا تحفہ

نَہجُ الْاَئِمَّۃِ فِیْ
اِصْلَاحِ الْاُمَّۃ

حصہ پنجم : خطاب ائمہ اور ان کا مقام

از : عبدالحفیظ ایلولوی (گجرات)

تفصیلات

نام کتاب : نَہجُ الْاَئِمَّۃ فِیْ اِصْلَاحِ الْاُمَّۃ

جامع و مرتب : مولانا قاری عبدالحفیظ صاحب ایلولوی

(خادم الحدیث والفقہ جامعہ حسینیہ راندیر، سورت)

پروف ریڈر : جناب حضرت مولانا خالد صاحب

جناب حضرت مفتی ابراہیم صاحب دھولکہ

کمپوزنگ : مولانا ضیاء الرحیم رحیمی (ہدایت آرٹ، سگرام پورہ، سورت)

صفحات :

سن اشاعت :

اول ایڈیشن :

ناشر: مکتبہ حبان

ایلول نزد نور مسجد

تحصیل: ہمت نگر، ضلع: سابر کانٹھا

گجرات، انڈیا

75750 90455

ناشر: مکتبہ احمدیہ

جامعہ حسینیہ راندیر، مورابھاگل، راندیر

سورت، گجرات، انڈیا۔

99746 04855

مختصر فہرست (حصہ پنجم)

باب: خطابِ ائمہ اور ان کا مقام

○	فصل اول: امور خطاب اور اس کے آداب	۵
●	ائمہ حضرات وعظ سے پہلے صلوٰۃ الحاجۃ ضرور پڑھیں	۵
!!	عبادت کی حقیقت	۶
●	جو بھی خطاب ہو مستند ہو اور مفید بھی	۸
←	چند ضروری ملحوظات برائے خطاب	۱۰
××	ائمہ حضرات کسی بھی مسلک وفرقہ کی تردید نہ کریں	۱۳
✓	حکومت کو بُرا کہنے کے بجائے لوگوں کو گناہوں۔۔	۱۴
✓	لوگوں کو پہلے غلطی کا احساس دلائیں۔۔۔	۱۵
✓	نصیحت کرنے کا درست طریقہ	۱۶
!!	ائمہ مسلمانوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کریں	۱۹
○	فصل دوم: ائمہ کا مقام اور ان کے احوال	۲۴
☼	خاتم الانبیاء بین الانبیاء والرسل علیہم السلام	۲۴
←	بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین مقاصد	۲۷
!!	منصب امامت تمام منصبوں سے بلند ہے	۳۱

●	امامت کی دو قسمیں	۳۲
!!	معیاری ائمہ	۳۳
←	علماء (ائمہ) پر اصلاح کی ذمہ داری	۳۴
!!	برتر علماء کی برتری صاحب شریعت کی زبانی	۳۵
!!	امیر کی اطاعت پر بشارت و نافرمانی پر وعید	۳۶
←	امام اپنے ماتحتوں کا نگراں ہے	۳۸
!!	امامت اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے	۳۹
!!	امامت کا حاصل ہونا بھی ایک امتحان ہے	۴۰
←	قرآن کی نظر میں برے علماء	۴۲
←	داعی الی النار ائمہ قرآن کی زبانی	۴۲
←	قوم کے بدتر سربراہوں کی عبرتناک سزا	۴۲
✡	**خاتمۂ کتاب**	۴۴



باب: خطابِ ائمہ اور ان کا مقام

فصل اول : امور خطاب اور اس کے آداب

انسانی زندگی میں وعظ وخطابت کا گوشہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کی اہمیت صرف دینی ذہن سازی میں ہی نہیں بل کہ دنیوی اور مادی امور میں بھی لوگوں کو آمادہ کرنے میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور اس کے لیے وہ بہترین مؤثر اور قوی ذریعہ ہے۔لہٰذا ائمہ حضرات خطابت میں درج ذیل آداب کی رعایت فرمائیں تا کہ خطاب مؤثر ہو۔

(۱) ائمہ وعظ سے پہلے صلوۃ الحاجۃ پڑھنے اور دعا مانگنے کا اہتمام کریں

آدمی جس طرح مقفل دروازے کو کھولنے کے لیے کنجی کی طرف سب سے پہلے توجہ کرتا ہے، بس اسی طرح ہر مسلمان کو اور خصوصًا امام صاحب کو چاہیے کہ خطاب سے پہلے اور ہر اہم کام کو شروع کرنے سے پہلے صلوٰۃ الحاجۃ کی طرف اور اللہ تعالیٰ سے استعانت ومدد طلب کرنے کی طرف توجہ کرے کیوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خاص سنت ہے۔

حضرت امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْن'' کے تحت لکھا ہے کہ جس طرح عبادت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوتی ہے جس کا اقرار ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ'' میں کیا گیا ہے اسی طرح استعانت بھی صرف اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل کی جاتی ہے جس کا اقرار ''وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْن'' میں کیا گیا ہے۔دونوں اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہیں۔اسی لیے آدمی کی نظر نماز ودعا یعنی عبادت واستعانت میں صرف اللہ تعالیٰ پر مرکوز ہوتی ہے لہٰذا ہر اہم کام سے

پہلے یہ دو چیزیں ضرور اختیار کرنی چاہیے۔

عبادت کی حقیقت

حضرت شیخ ابرار احمد دہلیوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ'' ترجمہ: ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ محققین فرماتے ہیں کہ نظر اللہ کی ذات پر ہو نہ کہ اپنے عمل پر ابلیس کی نظر اپنے عمل پر تھی اس لیے تباہ ہوا، محققین فرماتے ہیں عمل چھوڑا نہ جائے البتہ نظر عمل سے ہٹادی جائے۔

پھر لکھا ہے کہ صاحب کشاف لکھتے ہیں کہ ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ مقصود ذاتِ حق ہیں، صرف عبادت مقصود نہیں۔ اور عبادت کیا ہے؟ عبادت کی ساری روح حکم ماننا ہے بس وہ جو حکم دے وہی سر آنکھوں پر۔

چاہے وہ نماز پڑھنے کا حکم دے یا (مکروہ وقت میں) نماز چھوڑنے کا حکم دے۔ روزہ رکھنے کا حکم دے یا (عید کے دن) روزہ نہ رکھنے کا حکم دے۔ منکرات سے بچنے کا حکم دے یا معروفات کو بجالانے کا مکارم اخلاق کا حکم دے یا انسانیت کے حقوق کا حکم دے۔ خلاصہ یہ کہ وہ جو کہے بندہ اس کا پابند۔ وہ کہے تو کھانا عبادت وہ کہے تو بھوکا رہنا عبادت، وہ کہے تو نماز پڑھنا عبادت وہ کہے تو نماز چھوڑنا عبادت، وہ سونے کو کہے تو سونا عبادت جاگنے کو کہے تو جاگنا عبادت اگر محبت رکھنے کو کہے تو محبت رکھنا عبادت اور اگر عداوت رکھنے کو کہے تو عداوت رکھنا عبادت۔ مطلب اس طرح مزاج اور ذہن بنایا گیا کہ دار و مدار اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہے اپنے جذبات پر نہیں۔ (فیض ابرار ۵٦/۴)۔

آدمی جب اپنے افعال (اسباب) کی نفی کرتا ہے تو پھر کام بننا شروع ہو جاتا ہے۔

مثلاً یہ کہ میری تقریر، میری جد وجہد اور اصلاح سے کچھ نہیں ہوتا بل کہ اللہ تعالیٰ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے کہ وہی ہادی وہی فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْد ہے تو اللہ تعالیٰ کو ایسی عاجزی بہت پسند ہے اور اس عجز وانکساری اور جذبۂ خلوص پر مانگی ہوئی چیز اسے عطا فرماتے ہیں اور اس سے اس کے وعظ کا اثر لوگوں پر ہوتا ہے۔

اور اس کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ معرفت رکھنے والے کو جب اس طرح اعمال سے کام بنتے ہوئے نظر آتے ہیں تو اس کے ایمان ویقین میں اور معرفت میں اضافہ ہو جاتا ہے ”وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَاناً“۔ اور نظریں مزید اللہ پر مرکوز ہوتی ہیں۔

صلوٰۃ الحاجۃ ودعا کا یہ عمل خصوصًا جمعہ کے دن اہتمام سے انجام دیں جب کہ اس دن بہت سا مجمع دل میں دین کی طلب لے کر دین سیکھنے اور دینی باتیں سننے کی نیت سے آپ کی خدمت میں پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ان کے سامنے دین کی درست اور مفید باتیں آپ کی زبان سے کہلائے۔ یہ سوچیے اس مجمع کو آپ کی خدمت میں کون حاضر کرتا ہے، یہ اصلاحی اسلامی نظام جس کے آپ ذمہ دار بنے ہیں یہ کس کی شفقت ودعا اور کس کی جد وجہد وقربانیوں کا صدقہ ہے؟

کیا دوسرے مذاہب وادیان میں اپنے مذہب وادیان کے سیکھنے سکھانے اور سننے سنانے کا ایسا پختہ واعلیٰ نظام ہے جیسا اسلام میں؟ کہ ہر ہفتہ دنیا کی مساجد میں بغیر کسی اشتہار کے کروڑوں کا مجمع حاضر ہو جاتا ہے۔ یہ سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی بے مثال قربانیوں کا صدقہ ہے۔

لہٰذا ان قربانیوں کا پاس ولحاظ رکھ کر ایمانداری اور امانت داری سے مجمع کی صحیح صحیح رہ نمائی فرمائیں، اچھے طریقے سے ان کو سمجھائیں صرف واقعات سنا کر اوقات گزاری یا اپنے دلی جذبات کی تسکین کے مواد سے شرعی اس حق میں اپنے کو مورد الزام پر کھڑا نہ کریں کہ قیامت میں گریبان پکڑا جائے۔ اللہ تعالیٰ درست سمجھ اور درست عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور اس کی

صلاحیت سے بھی آپ کو نوازیں۔آمین۔

(۲) جو بھی خطاب ہو مستند ہو اور مفید بھی

حدیث شریف میں ہے "بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْاٰیۃ" مجھ سے (دین کی باتیں حاصل کرو پھر انہیں دوسروں تک) پہنچاؤ چاہے وہ ایک ٹکڑا ہی ہو۔دوسری روایت میں ہے کہ جس نے جان کر میری جانب جھوٹ یا جھوٹی بات منسوب کی تو وہ جہنم کو اپنا ٹھکانا بنائے۔(مشکوٰۃ ۳۲)۔محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس روایت کو متواتر بتایا ہے۔جس کا درجہ تمام احادیث کی قسموں میں سب سے اونچا ہوتا ہے۔ایک تیسری روایت ہے حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ علم (کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کا علم) دین ہے لہٰذا تم غور کرلو کہ تم اسے کس سے حاصل کررہے ہو۔(مشکوٰۃ ۳۷)۔یعنی یہ غور کرلو کہ تم دین کا علم معتبر اور ثقہ لوگوں سے حاصل کررہے ہو کہ غیر ثقہ سے ایسا نہ ہو کہ غیر ثقہ سے حاصل کرو۔

مذکورہ تینوں روایتوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ ہم پر یہ ذمہ داری ہے کہ اپنے علم کے بقدر دین کی باتیں دوسروں تک پہچائیں اور دین کی کوئی بھی بات کہنے اور نقل کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیں، اس کو قرآن وحدیث کی روشنی اور ما انا علیہ واصحابی کے دائرے اور اپنے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کی فکر ونظر کے احاطے میں کہیں [۱]۔

---

[۱] حدیث شریف کے نقل کے بارے میں محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے بڑی تعجب خیز بات لکھی ہے ۔کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث نقل کرنے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی چند قسمیں ہیں۔مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے میں مقدم ہونے کے باوجود اور اپنے بلند مقام کے باوجود دوسرے صحابہ کرام کے مقابلے میں کثرت احتیاط کے پیش نظر (جو مذکورہ حدیث سے ثابت ہے) بہت کم احادیث حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ خدانخواستہ کوئی بات ایسی نکل جائے جو حدیث کی نہ ہو۔ان پر خشیت کا غلبہ تھا۔ان کے بالمقابل حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ بکثرت احادیث نقل کرتے ہیں، کیوں کہ ان میں محبت کا غلبہ تھا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک کپڑا دس درھم میں خریدے اور ان میں ایک درہم حرام مال کا ہوتو اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس کی نماز قبول نہیں کرے گا جب تک اس کے جسم پر وہ کپڑا ہوگا۔اس روایت کوابن عمرؓ نےنقل کرنے کے بعد اپنی شہادت کی دونوں انگلیوں کو کانوں میں ڈالنے کے بعد فرمایا اگر یہ مذکورہ بات حضورﷺ کوفرماتے میں نے نہ سنا ہوتو اللہ کرے میرے یہ دونوں کان بہرے ہوجائیں۔(مشکوٰۃ ۲۴۳) مطلب کہ یہ میری بات نہیں یہ حضورﷺ کی بات ہے اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو میرے دونوں کان بہرے ہوجائیں۔اس سے اندازہ ہوا کہ صحابہ کرامؓ کتنا احتیاط کرتے تھے۔

امام ماوردی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا صلوٰۃ وسطیٰ کی تشریح کے ضمن میں جو اجتہاد نقل کیا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے۔ "اِذَا صَحَّ الْحَدِیْثُ فَهُوَ مَذْهَبِیْ وَاضْرِبُوْا بِمَذْهَبِیْ (القول) عَرْضَ الْحَائِطِ" (مرقات ۲/۱۴۷)۔یعنی امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب میرے قول اور حدیث شریف میں کوئی تضاد وٹکراؤ دیکھوتو میرا قول دیوار پر دے مارو (یعنی میرا قول اختیار نہ کرو) بل کہ حدیث شریف کو اختیار کرو۔سراج الامۃ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ "رَجَّحَ الْاِمَامُ الْاَعْظَمُ الْحَدِیْثَ وَلَوْ ضَعِیْفًا عَلَی الرَّاْیِ وَلَوْ قَوِیًّا" (مرقات ۱/۲۳۷)۔

(بقیہ صفحہ کے حاشیہ)اور محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس مذکورہ طرز عمل کے ضمن میں ایک عجیب بات یہ بھی لکھی ہے کہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نقل حدیث میں اس قدر احتیاط برتتے تھے کہ وہ کسی سے اس وقت تک حدیث قبول نہیں کرتے تھے جب تک اس کو اس بات کی قسم نہیں کھلا دیتے تھے کہ یہ بات میں نے آں حضرتﷺ سے سنی ہے۔لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بلاقسم ہی قبول کر لیتے تھے کیوں کہ صدیق تو صدیق ہی تھے۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی تابعی ہونے کے باوجود طرز عمل احتیاط فی الحدیث کا رہا جس کی وجہ سے ان سے بھی احادیث بہت ہی کم منقول ہیں۔(مرقات ۳/۲۱۰)۔

ملاحظہ کیجئے کہ امام اعظمؒ اور امام شافعیؒ اپنے قول پر حدیث کو ترجیح دے رہے ہیں۔
اس پوری تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ اولاً تو ہم قرآن وحدیث کی باتوں کو دوسروں تک پہنچائیں ان میں غفلت نہ برتیں اور ثانیاً ان کو نقل کرنے میں احتیاط سے کام لیں اور ثقہ لوگوں اور معتبر کتابوں سے نقل کریں، مبادہ نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق نہ ہو!!

(۳) چند ضروری ملحوظات برائے خطاب

۱۔ جو بھی چھوٹا بڑا خطاب ہو اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ ہو ذاتی جذبات کا اس میں دخل نہ ہو۔
۲۔ خیرخواہی مدنظر ہو، واعظ کا باطن جذبۂ ہمدردی سے لبریز ہو۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی خاص صفت ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ سامعین میں کسی بات کو پیدا کرنے اور لانے کے لیے، پہلے ان کو اپنے اعتماد میں لینا اور ان کو اس کا اعتماد دلانا ضروری ہے کہ آپ ان کے خیرخواہ ہیں۔ اگر ان کو آپ کے خیرخواہ ہونے کا اعتماد نہ ہوگا تو وہ آپ کی بات قبول ہرگز نہیں کریں گے۔ چناچہ انبیاء علیہم السلام یہی اعتماد دلانے کے لیے فرماتے تھے ''اِنِّیْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ'' لہٰذا جو امور اور جو کام خلاف اعتماد اور خلاف خیرخواہی ہوں ائمہ حضرات کو ان سے بچنے کا بے حد اہتمام کرنا چاہیے۔

۳۔ اصلاحی خطاب میں نیت عالم بھر کے انسانوں کی ہو نہ کہ صرف حاضرین کی بالواسطہ بلاواسطہ تبلیغ کے دونوں پہلو ملحوظ ہوں۔

۴۔ وعظ میں صرف اپنے شیخ کے حالات بیان کرنا یا ایک دوصدی پرانے مشائخ کے واقعات بیان کرنا بھی باعث خیر ہے اس کا بھی فائدہ ضرور ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بڑا فائدہ اور نتیجہ

کے اعتبار سے زیادہ مفید انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے واقعات کا ذکر کرنا ہے۔

کیوں کہ معیار دین وہی ہیں۔ کیوں کہ قرآن حکیم نے من حیث الجماعت اگر کسی پوری کی پوری جماعت کی تقدیس کی ہے تو وہ صحابۂ کرام کی جماعت ہے اس کو راضی و مُرضی اور راشد و مُرشد فرمایا ہے ان کا درجہ امت کا کوئی طبقہ یا امت کا کوئی فرد نہیں لے سکتا۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر امت متفق ہوجائے گی، ہوسکتا ہے کہ آپ کے مقتدیوں میں کچھ لوگ ہوں جن کو آپ کے شیخ یا آپ کے مسلک کے اکابر سے وہ عقیدت نہ ہو جو آپ کو ہے۔

۵۔ اہم باتوں کو سیدھے سادے انداز میں سمجھائیں۔ پر تکلف عبارتوں اور مشکل مضامین سے احتراز کریں۔ اوران کو آسان مثالوں سے سمجھائیں۔

۶۔ وعظ میں زبان صاف ہو کسی قسم کی تعقید نہ ہو۔

۷۔ آواز درمیانی ہو۔ نہ بالکل پست نہ اتنی موٹی کہ کانوں کے لیے بوجھ ہو۔ (اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ)۔

۸۔ خطاب سے پہلے درود شریف پڑھیں۔ اور ''رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ○ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ○'' ضرور پڑھ لیں۔ ترجمہ: اے میرے رب میرا سینہ کھول دیجیے، اور میرا کام آسان کر دیجیے، اور میری زبان کی گرہ کھول دیجیے، تا کہ لوگ میری بات سمجھ لیں۔ اور'' رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً'' بھی پڑھ لیں۔ اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔

۹۔ بات مثبت انداز میں ہو منفی انداز میں نہ ہو یعنی کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

۱۰۔معاشرہ کی رائج برائیوں کا تذکرہ بھی زیادہ نہ کیا جائے۔کیوں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے ”اِنَّ لِلّٰہِ عِبَاداً یُمِیْتُوْنَ البَاطِلَ بِھَجْرِہٖ وَیُحْیُوْنَ الْحَقَّ بِذِکْرِہٖ“ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو باطل کو مٹاتے ہیں باطل کا تذکرہ چھوڑ کر اور حق کو زندہ کرتے ہیں حق کا تذکرہ کر کے۔(حلیۃ الاولیاء ۱/۹۲)۔ہاں ان برائیوں سے کس طرح بچا جائے اس کے طریقے اور تدبیریں ضرور بیان کی جائیں۔

لٰہذا آپ یہ اصول اپنائیں کہ جو چیزیں آپ لوگوں میں لانا چاہیں ان کا تذکرہ زیادہ کریں،ان کے منافع،فضائل اور ان کی حکمتیں خوب بیان کریں۔اور جن برائیوں سے بچانا چاہیں ان کا تذکرہ چھوڑ دیں۔جیسے حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ والی محنت میں ہے،کیوں کہ مان لیجئے کہ آپ کو ۱۵ یا ۲۰ منٹ بیان کا موقع ملا اس میں دس منٹ برائیوں کے تذکرے میں آپ لگا دیں اور دس، پانچ منٹ ان برائیوں کے کرنے والوں کی غیبت میں خرچ کر دیں تو مقتدیوں کو ان برائیوں سے بچنے کا علاج کیا ملا؟ آپ ان کو برائیوں سے بچنے کا راستہ اور علاج بتائیں۔

۱۱۔ وعظ میں مختلف فیہ اور الجھاؤ میں ڈالنے والے مسائل کو نہ چھیڑیں جن سے لوگوں میں یا تو فتنہ ونفرت پھیلنے کا یا شکوک وشبہات پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔”یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا“ (بخاری ۱/۱۶)۔

لوگوں پر آسانی کرو ان کو تنگی میں مت ڈالو اور ان کو (اللہ تعالیٰ کی رحمت کی) بشارت سناؤ اور ان کو متنفر نہ کرو۔

۱۲۔ خطاب کے لیے موزوں کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔اور اس سے مطلوبہ مواد کی پوری تیاری کریں۔

۱۳۔خطاب کے بعد استغفار ضرور فرمالیں۔

۱۴۔ خطاب سے فراغت کے بعد کوئی شخص کوئی بات تسلی کے لیے پوچھے تو اسے مطمئن کریں۔ اور مجمع میں اپنے سے بڑی شخصیت ہو تو اصلاح کی درخواست بھی کرلیں۔

(۴) ائمہ کسی بھی مسلک وفرقہ کی تردید نہ کریں

مسالک اربعہ (حنفیت،شافعیت، مالکیت اور حنبلیت) کی تردید کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا کہ یہ چاروں مسالک اپنی اپنی جگہ برحق اور اہل السنۃ والجماعت میں سے ہیں، ان کا تو اختلاف بھی رحمت ہے بل کہ وہ مذہب اسلام کی تقویت وتوسیع کا ذریعہ ہیں اور سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مختلف نورانی سنتوں کا مخزن ومحافظ ہیں۔

لیکن ادیان باطلہ (کفروشرک، یہودیت ونصرانیت اور رافضیت وبدعت وغیرہ) کی تغلیط میں بھی اس قدر غلو نہ کریں کہ خطاب کا صرف یہی ایک مقصد بن کر رہ جائے۔کیوں کہ ان کی تغلیط کا مقام جمعہ کے دن ۱۵ منٹ کا یہ خطاب نہیں۔کیوں کہ اس سے عوام کو کچھ فائدہ نہیں بل کہ وہ اور زیادہ بھڑک جائیں گے اور اصلاح کا دروازہ بند جائے گا بل کہ خود اپنے مسلک کے بارے میں بھی شکوک وشبہات میں گرفتار ہو جائیں گے اور بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔

حضرت رابعہ بصریہ رحمہا اللہ تعالیٰ سے کسی نے پوچھا کہ شیطان کو برا کہنا کیسا ہے؟ (حالاں کہ بظاہر یہ سوال کی چیز نہیں تھی کیوں کہ قرآن شریف نے اسے برا اور ملعون کہا ہے) تو رابعہؒ نے جواب دیا شیطان کو برا کہنے سے تو میرا کوئی فائدہ نہیں ہوگا ہاں اگر اتنا وقت میں ذکر اللہ میں صرف کروں تو اس میں میرا ضرور فائدہ ہوگا۔معلوم ہوا کہ ہمیں اپنے نفع ونقصان کو مدنظر رکھ کر کسی عمل کو اختیار کرنا چاہیے۔حضرت ابوجری جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ اسلام میں داخل ہوئے تو

آپؐ نے ان کو کچھ نصیحتیں کیں۔اس میں یہ بھی ہے "لَاتَسُبَّنَّ اَحَدًا" کہ کسی کو گالی مت دینا یعنی برا بھلا مت کہنا چناں چہ ابو جری فرماتے ہیں "فَمَا سَبَبْتُ بَعْدَہٗ حُرًّا وَلَا عَبْدًا وَلَا بَعِيْرًا وَلَا شَاۃً" (مشکوٰۃ ۱۶۹)۔میں نے اس نصیحت کے بعد کسی کو بھی برا بھلا نہیں کہا نہ کسی آزاد و غلام شخص کو نہ کسی اونٹ اور بکری کو۔ ۱؎

(۵) حکومت کو برا کہنے کے بہ جائے لوگوں کو گناہوں سے بچائیں

حضرت حکیم الامت مجدد الملت علامہ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ مصائب سے تنگ آکر حکام وقت کو برا بھلا کہتے ہیں یہ بھی بے صبری کی علامت ہے۔ یہ کوئی پسندیدہ تدبیر نہیں ہے۔بل کہ حدیث شریف میں تو اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ "فَلَا تَشْتَغِلُوْا بِسَبِّ الْمُلُوْكِ" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بادشاہوں کو برا مت کہو ان کے قلوب میرے قبضہ میں ہیں، میری اطاعت کرو میں ان کے دلوں کو تم پر نرم کردوں گا۔ (فیض القدیر ۵/۴۷)۔

۱؎ اس کے تحت حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ برا بھلا نہ کہنے کا یہ حکم سد باب کے طریقے پر ہے، ورنہ مخصوص لوگوں کو یعنی جن کا کفر پر مرنا یقینی ہو ان کو برا بھلا کہنا جائز ہے۔پھر لکھا ہے کہ پھر بھی افضل یہ ہے کہ کسی کو بھی برا بھلا نہ کہے بل کہ اتنا وقت ذکر اللہ میں صرف کرے حتی کہ شیطان کی لعنت سے بھی بچ کر ذکر اللہ اختیار کرے کہ وہ افضل ہے۔

کیوں کہ دل میں ما سوا اللہ کا خیال آنا بہر حال نقصان کا باعث ہے۔"وَالْاَفْضَلُ اَلْاِشْتِغَالُ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ حَتّٰی عَنْ لَعْنِ الشَّيْطَانِ فَاِنَّ خُطُوْرَ مَا سِوَا اللهِ فِي الْخَاطِرِ نُقْصَانٌ۔ (مرقات ۴/ ۲۱۲)۔

چناں چہ قرآن شریف میں ہے "قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ" (سورۃ الانعام ۶۵)۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر بھی وہی (اللہ تعالیٰ) قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیجدے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اوپر کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ اور بے رحم حکام مسلط ہو جائیں، اور نیچے کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ اپنے نوکر اور غلام اور ماتحت خدمت گار و ملازم بے وفا، غدار کام چور اور خائن ہو جائیں۔

چناں چہ اس تفسیر کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان ارشادات سے بھی ہوتی ہے۔ فرمایا "كَمَا تَكُوْنُوْنَ كَذٰلِكَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ" جیسے تم ہوں گے ویسے تمہارے امراء ہوں گے۔ (بیہقی ۹/۴۹۲)۔ اور فرمایا "اَعْمَالُكُمْ عُمَّالُكُمْ" یعنی جیسے تمہارے اعمال ویسے تمہارے حکمراں۔ حیاۃ الصحابہؓ میں ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تو کافروں کی بھی ہلاکت نہیں چاہتے تھے بل کہ ان کی ہدایت چاہتے تھے لہٰذا کافر حکاموں کی ہدایت کی دعا کرنی چاہیے۔

(۶) لوگوں کو پہلے غلطی کا احساس دلائیں پھر نصیحت کریں

"لاتحزن" کے مصنف فرماتے ہیں جب کوئی واعظ مخاطبین کو ان کی غلطی کا بھرپور احساس دلاتا ہے بایں معنی کہ اس کی قباحت کو واضح کرتا اور اس کے برے نتائج کو بتاتا ہے اور غلطی کے احساس دلانے کا تقاضا اور وقت بھی ٹھیک ہو اور نصیحت کرنے کا طریقہ بھی درست ہو اور اس کے پاس نصیحت کے دلائل بھی موجود ہوں تو سامعین کو ایسی نصیحت قبول کرنا آسان ہوتا ہے اور ایسی نصیحت کارگر ہوتی ہے۔

لہٰذا ائمہ حضرات حتی الامکان دوسروں کو ان کی غلطیوں پر لعن طعن کرنے سے اور انہیں

ملامت کرنے سے پرہیز کریں کیوں کہ ملامت کا اثر کوڑے کی مار کی طرح ہوتا ہے۔بل کہ اصلاح کا ایسا طریقہ اختیار کریں جو زخموں پر پھایوں اور مرہم کا کام کرے نہ کہ نمک کا۔اصلاح کے موقع پر یہ خیال کریں کہ اگر غلطی کرنے والا میں خود ہوتا تو میں اپنے لیے نصیحت کا کون سا طرز پسند کرتا سختی کا کہ نرمی کا؟

(۷) نصیحت کرنے کا درست طریقہ

کسی بھی قوم و جماعت یا فرد کو نصیحت کرنے میں حکمت کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔
قرآن شریف میں ارشاد ہے ''اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ'' (سورۃ النحل ۱۲۵)۔اے نبی اپنے رب کے راستے کی طرف (لوگوں کو) حکمت اور اچھی (نرم) نصیحت سے بلائیے۔

اس آیت شریفہ میں دعوت الی اللہ کے آداب بیان ہوئے ہیں۔جس میں تین چیزیں ہیں۔(۱) پہلی چیز ہے حکمت اس میں بتایا گیا ہے کہ داعی کا کام صرف ایک پیغام و کلام لوگوں کے کانوں میں ڈال دینا نہیں ہے، بل کہ حکمت و تدبیر سے مناسب وقت مناسب ماحول دیکھ کر ایسے عنوان سے پہونچانا ہے کہ مخاطب کے لیے قبول کرنا آسان ہو جائے۔

راقم الحروف کو ایک جگہ بارہا نماز جمعہ ادا کرنے کا موقع پیش آتا ہے۔وہاں کے کچھ لوگ نماز جمعہ اور دعا کے بعد سنتوں کو پڑھے بغیر چل دیا کرتے ہیں تو امام صاحب دعا کے بعد ہمیشہ یہ کہا کرتے ہیں کہ بھائی سنتیں پڑھ کر جاؤ۔یہ کہنے کے باجود راقم نے اب تک کوئی فائدہ حاصل ہوتے نہیں دیکھا۔بل کہ حکمت کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس طرح کہنا مقصود کے لیے مُضر ہے کیوں کہ یہ صرف کانوں میں بات ڈالنا ہوا اور جب فائدہ نہ ہو پھر بھی بار بار کہتے رہنا

اس پر جمانے کے مترادف ہے۔

ایسے موقع پر اگر وہ امام صاحب حکمت سے یہ کہیں کہ جو لوگ دعا کے بعد چلے جایا کرتے ہیں وہ ماشاء اللہ شریعت پر عمل کرنے کے لیے چلے جاتے ہیں کیوں کہ شریعت نے ہم کو تعلیم دی ہے کہ ہم نفل وسنت نمازوں کو گھروں میں پڑھا کریں۔تو اس سے دو فائدہ حاصل ہوں۔ اگر نہ پڑھتے ہو تو اچھے اسلوب سے پڑھنے پر ترغیب حاصل ہوگی اور اگر پڑھتے ہیں تو گھروں میں پڑھنے کی ترغیب۔اسی کو اچھی نصیحت کرنا کہتے ہیں۔

اور ساتھ ہی یہ بھی کہیں کہ ہم کیسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ پڑھتے ہی نہیں کیوں کہ اس طرح کسی سے بدظن ہونا گناہ ہے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ وہ گھروں پر پڑھا کرتے ہیں۔اس طرح مثبت انداز سے حکمت کو ملحوظ رکھ کر سمجھایا جائے تو ان شاء اللہ ضرور مفید ہوگا۔اور اگر گھروں پر پڑھنے کی حکمت بھی بتائی جائے تو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ۔مثلاً گھروں کو ویران ہونے سے بچانا اور ان کو عبادت سے آباد کرنا۔اور چھوٹے بڑوں کے لیے عبادت کرنے کا نمونہ پیش کرنا کہ اس سے ان میں نماز وعبادت کو قائم کرنے کی عملی تبلیغ ہوگی۔

دوسری چیز موعظۃ ہے۔جس کے معنی ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ نیک کام کی طرف بلانے کے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ داعی کے لیے ضروری ہے کہ جو کلام کرے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ سے کرے۔

تیسری چیز موعظۃ کے ساتھ حسنۃ کی قید ہے۔اس میں اشارہ ہے عنوان کو نرم اور دل نشین بنانے کی طرف۔ کیوں کہ بعض اوقات خالص ہمدردی اور خیر خواہی سے کسی کو بھلائی کی طرف بلایا جاتا ہے مگر عنوان اور لب ولہجہ دل خراش ہوتا ہے تو وہ دعوت مؤثر نہیں ہوتی اس لیے

حسن کی قید لگا کر لب ولہجہ کو نرم رکھنے کی تاکید کر دی۔

اچھی طرح نصیحت کا مطلب یہ بھی ہے کہ مخاطب کے درجہ کا لحاظ رکھ کر وعظ کریں۔ وہ ایسا پر اثر ہو کہ اپنی سحر انگیزی سے مخاطبین کو مسحور کر دے اور آسان و مرتب ہونے کی وجہ سے ادنی شخص بھی اپنا دامن مراد بھر سکے اصولی بات کی جائے فضولی نہیں۔ بات جب موزوں ہوگی تو سامعین کے دلوں کی تہ میں پہنچے گی۔ اس کے لیے حالات کا جائزہ لینا بھی سیکھیں اور مطالعہ بھی کریں۔ مختصر مطالعہ خطیب کی زبان کی بندش کا ذریعہ ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ چاہا کہ معاذ رضی اللہ عنہ کو نماز کے بعد ذکر کرنے کو سمجھاؤں تو آپ نے پہلے اللہ کی قسم کھا کر ان سے محبت کا اظہار کیا اور یوں فرمایا ''اے معاذ واللہ میں تم سے محبت کرتا ہوں'' پھر ذکر کرنے کو کہا کہ ''تم ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرو۔ (مشکوۃ ۸۸)۔ آپ نے ان چند کلمات کے ورد کو سکھانے کے لیے جس حکمت سے کام لیا اس سے ایسا اثر ہوا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے آپ کے اس جملے سے بے حد خوشی ہوئی اور اس نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھا۔ اس طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں تشہد کا واقعہ۔ کہ پہلے آپ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر تشہد سکھایا جس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آپ کے وصال کے بعد بھی بطور فخر اس واقعہ اور اس کی کیفیت کو یاد کرتے تھے۔

دراصل آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعامل (معاملہ) جسموں سے پہلے دلوں سے وابستہ ہوتا کیوں کہ آپ اس کو بخوبی جانتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی عام انسانوں کی طرح انسان ہیں وہ کوئی بے حس مشینین نہیں لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکمت سے کام لے کر سمجھاتے جس سے صحابہ فوراً اسے

قبول کر لیتے۔ لہٰذا ہمیں بھی مقتدیوں کو سکھانے اور ان کی اصلاح میں حکمت سے کام لینا چاہیے۔حکمت کا ایک مطلب اس کا اکرام بھی ہے۔آپ پہلے اس شخص کے اکرام کی شکل اختیار کریں جسے نصیحت کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی یہ نصیحت حکمت پر مبنی سمجھی جائے گی پھر وہ اثر انداز ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حکمت وفراست سے نوازیں اوراس پر عمل کی پوری توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین۔

(۸) ائمہ کا اہم کام مسلمانوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا بھی ہے

ائمہ حضرات کو اس کا احساس ہونا ضروری ہے کہ امت اپنا قیمتی اثاثہ (جان مال اور وقت) کہاں صرف کررہی ہے۔اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں جتنی برائیاں اور جتنے گناہ ہورہے ہیں وہ اس جان ومال اور وقت کو بے محل استعمال کرنے کا ہی نتیجہ ہے۔اگر یہ اپنی صحیح جگہوں میں لگتے تو یہ گناہ نہ ہوتے۔حضرت جی مولانا انعام الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ بڑا ہی زریں جملہ فرماتے تھے اگر امت کی جان ومال اور وقت لگنے کی جگہ نہ لگیں تو نہ لگنے کی جگہ لگیں گے، اگر تم کرنے کے کام نہیں کروگے تو نہ کرنے کے کام کروں گے۔آج یہی ہورہا ہے۔

لہٰذا ائمہ حضرات مقتدیوں کو کہیں کہ وہ اپنے پاس ایک ڈائری رکھیں اس کے ذریعہ اپنا احتساب کرتے رہیں، وہ اس میں اپنی منفی عادتیں لکھیں یعنی جو کام نہ کرنے تھے وہ کرلیے تو ان کو لکھ لیں پھر ان کا علاج کریں اور چھوڑ دیں۔

مفکرین فرماتے ہیں کہ روزمرہ کی زندگی میں ہماری تین بھاری غلطیاں برابر ہوتی ہیں اور تعجب یہ ہے اس کو غلطی نہیں سمجھتے!!۔(۱) وقت کی بربادی۔وقت کو ضائع کرنا بیوقوفی ہے، وہ خود کشی کے مرادف ہے۔ جتنے لوگ (مفسر محدث خطیب داعی مصنف اہل اللہ ڈاکٹر اور جج وغیرہ)

بڑے رتبے پر پہنچے ہیں وہ وقت کی قدر کرنے سے ہی پہنچے ہیں۔(۲) لایعنی باتیں کرنا۔آدمی کے اچھے مسلمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ لایعنی باتیں چھوڑ دے۔(۳) چھوٹی چھوٹی اور کم تر باتوں پر دھیان دینا۔مثلاً افواہ بازوں کی باتوں پر حوصلہ شکن اور خیالی اور بیکار وسوسوں اور شکوک وشبہات پر دھیان دینا۔

یہ تین خرابیاں اگر دور ہوجائیں تو معاشرہ فوراً اچھائی کے راستہ پر پڑ جائے۔(غم نہ کریں ۲۲۲)۔کتابوں میں لکھا ہے کہ تین لذتیں مہلک ہیں آدمی کو چاہیے کہ ان سے اجتناب کرے (۱) لذت طعام (۲) لذت نظر (۳) لذت کلام۔

انسانی بدن جادو کا ایک بکس ہے جس میں طرح طرح کی صلاحیتیں قوتیں ایسی ہیں کہ ان کو خوردبین لگا کر دیکھا جائے تو بھی نظر نہ آئیں!!!۔اگر مداری کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے تھیلے میں کون کون سی چیزیں موجود ہیں تو وہ تماشا دکھا نہیں سکتا اسی طرح جب تک آپ کو اس بات کا ادراک نہ ہو کہ آپ کے بدن میں کون کون سی نظر نہ آنے والی قوتیں پوشیدہ ہیں آپ اس سے حیرت انگیز کام نہیں لے سکتے!!

اسی کی طرف اشارہ ہے اس حدیث شریف میں "اَلنَّاسُ مَعَادِنُ کَمَعَادِنِ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ" (مشکوٰۃ ۳۲)۔لوگ کانیں ہیں سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح۔یعنی جس طرح زمینوں میں مختلف قسم کی اعلی اوسط ادنیٰ دھاتیں چھپی ہوئی ہیں۔مثلا سونے چاندی پیتل لوہا وغیرہ۔اسی طرح لوگوں میں بھی مختلف قسم اور مختلف درجات کی صفتیں حمیدہ پائی جاتی ہیں۔مثلا اللہ تعالیٰ پر توکل، تحصیل علم، عمل صالح، ہمدردی، ایثار، تواضع، صبر وتحمل اور تقویٰ ودنیا سے بے رغبتی وغیرہ۔

لیکن جس طرح زمین کی ان دھاتوں سے اس وقت تک استفادہ ممکن نہیں ہوتا جب تک انہیں دریافت کر کے مٹی سے نکال کر آگ کی بھٹی میں تپا کر صاف نہ کیا جائے، اسی طرح لوگوں کی وہ اوصاف اور وہ صلاحیتیں جو ان میں فطری طور پر پائی جاتی ہیں وہ اس وقت تک کار آمد نہیں ہوتی جب تک انہیں دریافت کر کے مجاہدہ کی بھٹی میں تپا کر صاف نہ کیا جائے اور ان کو نکھارا نہ جائے۔

ائمہ حضرات کا کام یہ ہے کہ جن صلاحیتوں کا علم حدیث سے ہوا ان کو مختلف تدبیروں اور حکمتوں سے اجاگر کریں اور وعظ وتقریر سے ان کو ان کی خداداد صلاحیتوں سے آگاہ کریں۔ جب اپنے خطاب میں اس کو موضوع بنا کر ان کو متنبہ کریں گے تو کسی کا ایمان حرارت حاصل کرے گا، کسی میں تقویٰ وخشیت کی امنگ ابھرے گی، کسی میں ایثار و ہمدردی کا جذبہ جوش مارے گا۔ اس طرح دیگر اعمال حسنہ کا حال ہوگا اور امت کی جان و مال اور وقت صحیح جگہ صرف ہوں گے اور جب یہ تینوں بری جگہ سے ہٹ کر صحیح جگہ استعمال ہوں گے تو ایک تیر سے دو شکار ہوں گے کہ بیک وقت برائیاں مٹیں گی اور بھلائیاں اور اچھائیاں رائج اور عام ہوں گی!!

آج ایسے ائمہ کی کتنی ضرورت ہے! جو لوگوں کو ان کی باطنی صلاحیتوں سے واقف کریں اور ان کو دین و دنیا کے بڑے بڑے مقام پر کھڑا کریں۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ جب تک کوئی ان کو واقف نہیں کرے گا وہ بڑی کامیابیوں اور بڑے درجات سے محروم رہیں گے۔

کیوں کہ انہیں اپنے اندر کی صلاحیتوں کا کوئی علم ہی نہیں اور اگر کچھ علم ہے بھی تو اپنی سستی کی وجہ سے یا معمولی معمولی عذر کی وجہ سے یا احساس کہتری کی وجہ سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرے بس میں نہیں۔ اور دوہری خطا یہ کرتا ہے کہ شعور کے بعد اپنی ناکامی کا سبب کبھی تو

اپنے والدین کو، کبھی بچپن کے اساتذہ کو، کبھی اپنے خاندان کو بل کہ کبھی پوری برادری کو قرار دیتا ہے اور ان کو قصور وار ٹھیرا تا ہے کہ انہوں نے ہمیں صحیح راستہ نہیں بتایا۔

انہوں نے ہماری صحیح تربیت نہیں کی ورنہ ہم بھی فلاں شخص کی طرح بلند درجہ پر اور پہاڑ کی چوٹی پر ہوتے جس طرح وہ پہاڑ کی چوٹی پر ہیں۔ اور اس خیال کی وجہ سے کتنے لوگ مصیبت کی زندگی اور حزن وغم کے کڑوے گھونٹ پیتے زندگی کاٹ رہے ہیں۔ بطور خاص اس وقت جب کہ پڑھائی اور اچھی تعلیم کے بعد بھی اچھی ملازمت میسر نہ ہوئی ہو، اچھی خاصی مزدوری کے بعد بھی روزی کے دروازے اس پر نہ کھلے ہوں۔

حالاں کہ اس مصیبت اور اس حزن وغم کو ''بعض دفعہ'' ایک لمحہ میں دور کرنا اس کے بس میں ہوتا ہے، لیکن غفلت وسستی اور احساس کہتری کی وجہ سے اس کی صلاحیتوں پر تالے پڑ جاتے ہیں اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان تالوں کی کنجیاں دوسروں کے پاس ہیں!! حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا آپ ائمہ حضرات اپنے مقتدیوں کو اس بھنور سے نکالنے کے لیے سمجھا دیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان صلاحیتوں کو معلوم کرنے میں از خود اگر محنت وفکر سے کام نہیں لیں گے تو وہ صلاحیتیں ان کے سینوں میں دب کر دفن ہو کر رہ جائیں گی اور ساری عمر حسرت لیے موت کے گھاٹ اتر جائیں گے،

ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ فلاں شخص پہاڑ کی چوٹی پر ہے اور میں کیوں نہیں۔ غریب مالدار کو، عہدے دار بڑے عہدے دار کو، کم عزت دار بڑی عزت دار کو، جاہل عالم کو، چھوٹی مسجد کا امام بڑی مسجد کے امام کو بلندی اور چوٹی پر دیکھتا ہے اور حسد وکینہ کی وجہ سے اندر ہی اندر رنج وغم سے بے قرار ہوتا ہے!! تنہائی میں آنسو بہاتا ہے، لیکن یہ نہیں سوچتا کہ اندھیرے کو کوسنے کے بجائے اپنا چراغ ٹھیک کرنے کی کوشش میں لگنا عقلمندی ہے۔

اگر ہم سب آج ہی سے ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش شروع کر دیں تو مہینوں میں نہ سہی سالوں اور برسوں میں ضرور پہاڑ کی چوٹیوں پر پہنچ کر رہیں گے۔ اگر ہم اپنی قیمت چاہتے ہیں تو پہلے جد وجہد کی بھٹی میں اپنے کو تپانا ہوگا، جس کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں اپنے ہی خاندان، اپنے ہی معاشرے کے کامیاب افراد کے اطوار واحوال پر نگاہ ڈالیں پھر یہ دیکھیں کہ ایک کامیاب باپ کا اپنی اولاد کے ساتھ کیسا سبھاؤ ہے ایک کامیاب بیوی اپنے شوہر کے ساتھ کیوں کر خوش وخرم زندگی گزار رہی ہے۔

خوش نصیب لوگ یا تو خود اپنے اندر موجود صلاحیتوں کا کھوج لگا لیتے ہیں، یا تعلیمی مرحلے میں اس کا کوئی ایک استاذ اس کے بیدار مغز پر مطلع کر دیتا ہے یا ادارے کے ملازم کو اس کا کوئی نگراں ان صلاحیتوں سے باخبر کر دیتا ہے یا اس کا سچا خیر خواہ کوئی دوست یا خاندانی کوئی شخص ایسا نکل آتا ہے جو اسے واقف کر دیتا ہے۔ ہر چند کے ایسے ناصحین کسی کو کم ہی میسر آتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ ہزاروں صلاحتیں اندر ہی اندر قید و بند ہو کر رہ جاتی ہیں اور یہ غنچے بن کھلے مرجھا جاتے ہیں!!

ع (حسرت تو ان غنچوں پر ہے جو بن کھِلے مرجھا گئے!!)

کتنے لوگ ہیں جن کے ہاتھ پاؤں آنکھیں کان اور زبان سلامت ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو حزن وغم اور افسردگی سے چھٹکارا دلانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ آخر یہ لوگ اپنی زندگی سے دلچسپی کیوں نہیں لیتے !!!! اپنی صلاحیتوں سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے !!! جب کہ اللہ تعالیٰ نے بولتی زبان دیکھتی آنکھ سنتے کان عطا کئے ہیں۔

یَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

فصل دوم : ائمہ حضرات کا مقام اور ان کے احوال

(۱) خاتم الانبیاءؐ بین الانبیاء والرسُل

بغرض تیمن و برکت ائمہ کے مقام کو ذکر کرنے سے پہلے آں حضرت صلی اللہ علیہ کے مقام کے ذکر سے ابتدا کی جاتی ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ متبوع سے تابع کی ذمہ داریاں واضح ہو جائیں۔ احادیث معراج میں سے ایک حدیث قدسی مبارکہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد منقول ہے۔ "جَعَلْتُكَ اَوَّلَ النَّبِيِّينَ خَلْقًا وَاٰخِرَهُمْ بَعْثًا"۔ (بعض الحدیث۔ رواہ البزار واحمد)۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے آپ کو (جملہ) مخلوق کا اول نبی اور (وجود و زمانہ) بعث کا آخری نبی بنایا ہے۔

اور حاکم کی روایت میں ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ" (رواہ الحاکم) (حاشیہ نبراس محمد برخوردار شاہ عبدالحق اکیڈمی سرگودھا پاکستان، شرح، شرح العقائد ۴۳۵)۔ کہ میں اس وقت سے نبی بنایا جا چکا ہوں جب حضرت آدم علیہ السلام ابھی روح (لطیف) اور جسدِ (خاکی) کے درمیان تھے۔ یعنی وہ مابین العدم والوجود تھے۔ مطلب تمام نبیوں کی سیرت کا آغاز دنیوی وجود کے بعد ہوا لیکن انبیاء کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا آغاز تمام انبیاء علیہم السلام کے وجود سے بھی پہلے ہوا۔

چناں چہ حدیث شریف میں ہے "اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ رُوْحِيْ" کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میری روح کو پیدا فرمایا۔ اسی مفہوم کو بانی دار العلوم حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے شعر میں یوں پیش کیا ہے۔ شعر

محمد کی نبوت دائرہ ہے نورِ وحدت کا	اسی کو ابتدا کہیے اسی کو انتہا کہیے

علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتاب الخصائص کے اوائل میں حدیث شریف "اُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَّۃً وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ" (مسلم)۔کے تحت علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف جن وانس کے نبی نہیں تھے بل کہ ملائکہ علیہم السلام کے بھی نبی تھے۔اور علامہ بازری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بل کہ آپ تمام حیوانات وجمادات، شجر وحجر سبھی کے نبی تھے، کیوں کہ ان سب ہی نے آپ کی نبوت کی شہادت دی ہے۔

پھر علامہ سیوطیؒ نے ترقی کرتے ہوئے علامہ تاج الدینؒ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبیوں کے بھی نبی تھے۔یعنی تمام نبیوں کے درمیان آپ کی حیثیت شہنشاہ اور سلطانِ اعظم کی طرح ہے، اور تمام انبیاء علیہم السلام کی حیثیت فوجوں کے کمانڈروں کی طرح۔اگر وہ آں حضرت کو پاتے تو تمام نبیوں پر آپؐ کی اتباع ضروری ہوتی۔خلاصہ یہ کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دنیا میں جسمانی وجود نہ ہوا اس عرصہ میں تمام انبیاء علیہم السلام آپ کے نائب بن کر رہے۔اس لیے کہ آپ از آدمؑ تا قیامت تمام مخلوق کی طرف مبعوث ہیں۔

"اِنَّ مُحَمَّدًا نَبِیُّ الْاَنْبِیَاءِ فَھُوَ کَالسُّلْطَانِ الْاَعْظَمِ، وَجَمِیْعُ الْاَنْبِیَاءِ کَاُمَرَاءِ الْعَسَاکِرِ وَلَوْ اَدْرَکَہٗ جَمِیْعُ الْاَنْبِیَاءِ لَوَجَبَ عَلَیْھِمْ اِتِّبَاعُہٗ، اِذْھُوَ مَبْعُوْثٌ اِلٰی جَمِیْعِ الْخَلْقِ مِنْ لَدُنْ اٰدَمَ اِلٰی قِیَامِ السَّاعَۃِ، فَکَانَتِ الْاَنْبِیَاءُ کُلُّھُمْ نَوَابُہٗ مُدَّۃَ غَیْبَۃِ جِسْمِہِ الشَّرِیْفَۃِ" (حاشیہ نبراس ۴۴۵ محمد برخوردار سرگودھا پاکستان)۔

چناں چہ "عہدالست" کے ذکر کے تحت روایتوں میں اس کا ذکر بھی ہے کہ تمام انسانوں سے تو صرف ایک ہی عہد لیا گیا جو مشہور ہے۔لیکن انبیاء علیہم السلام سے اس کے ساتھ

ایک خصوصی عہد یہ بھی لیا گیا کہ اگر تمہارے سامنے ایسا رسول آجائے'' اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں'' جو تمہارے پاس کی چیزوں کی تصدیق کرے (خبر دے) تو تم اس پر (اسی طرح ایمان لاؤ گے (جس طرح امتیں اور قومیں تم پر ایمان لاتی ہیں) اور تم اس کی ضرور مدد کرو گے۔ (ال عمران آیت نمبر ۸۱۔ عن ابی بن کعب مشکوۃ ۱/۲۴)۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ تمام انبیاء بھی آپ پر ایمان لائے ہیں تو پھر آپ نبیوں کے نبی ہوئے اور ملا علی قاریؒ نے بھی حضرت جابرؓ کی روایت مشکوٰۃ ۱/۳۰) کے تحت یہ الفاظ لکھے ہیں۔ ''فَهُوَ نَبِيُّ الْاَنْبِيَاءِ وَاِمَامُ الرُّسُلِ'' (مرقات ۱/۲۵۱)۔

اور ہمارے اکابر دیوبند میں سے امام عصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے قصیدۃ حب الرسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آں حضرتؐ کو تمام نبیوں کا نبی قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ نَبِيُّ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ۔۔۔وَطٰهٰ وَيٰسِيْن فَيْضٌ عَمِيْمٌ۔۔۔

غالباً اسی وجہ سے علمائے اسلام کا تقریباً یہ اتفاقی مسئلہ مذکور ہے کہ'' قبر اطہر سے جسم اطہر کا جو حصہ متصل ہے وہ نہ صرف مکہ المکرمۃ و مدینۃ المعطرہ بل کہ کعبۃ اللہ الجلیلہ وعرش الرحمن سے بھی افضل ہے'' ''نقلَ القاضِی عیاضُ رحمه الله تعالیٰ وغیرُہ الاجماعُ علیٰ تفضیلِ ماضُمَّ الاعضاءَ الشریفۃَ حتی علیٰ الکعبۃِ المنیفۃِ۔۔۔ بل هُوَ افضلُ مِنَ العرشِ کما نُقِلَ عن ابِی عقیلِ الحنبلِي رحمه الله تعالی'' (مرقات ۲/۱۹۰)۔ خلاصہ یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف سید الاولین والاخرین ہیں نہ خاتم النبین نہ امام الانبیاء بل کہ نبی الانبیاء اور مبدء انبیاء ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مذکورہ تمام مقامات میں آپ کو نبیوں کا نبی قرار دیا گیا ہے۔

يَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مالک عرش کے یہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا مقام ہے۔

اب ایک توجہ یہ فرمائیں کہ آپ (ائمہ وعلماء) کس کے وارث ہیں اور کس کے امتی؟۔اور ایک دوسری توجہ اس پر فرمائیں کہ کیوں وارث ہیں اور کس میں؟ یہ سارے ہی گوشے تفصیل طلب ہیں ہم نے ان اشارات میں آپ کو آپ کے اعلیٰ مقام کی طرف توجہ دلادی کہ آپ کس منصب پر فائز ہیں اور آپ کی ذمہ داریوں کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ آپ کی ذمہ داریاں کیا ہیں!!۔

ایک بات بڑے افسوس کی یہ ہے کہ ہم نے صرف اپنے نبی کو فضیلت کی حیثیت سے دیکھا ہے لیکن اسوہ کی حیثیت سے نہیں دیکھا ''لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ'' ہمیں چاہیے کہ اپنی زندگی کو مکمل نبی کے اسوے میں رنگ دیں ایسی کہ رنگی زندگی میں کوئی جگہ رنگ سے خالی نہ رہے، ہمارا ہر قدم ہر لمحہ اور ہر عمل اس اسوے پر اس طرح فٹ ہو جس طرح کسی بوتل کا ڈھکن اپنی بوتل پر ہی فٹ ہوتا ہے دوسری پر نہیں۔

(۲) بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین مقاصد

اللہ تعالیٰ کا عالی اور مبارک ارشاد ہے ''رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ'' (بقرۃ ۱۲۹) ۔اے ہمارے پروردگار اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھائے ان کو کتاب اور تہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو بیشک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

مفسر قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ آیت شریفہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس میں بعثت نبوی کے تین مقاصد کا بیان ہے۔۔۔ایک قرآنی آیات کی تلاوت اور انہیں پڑھ کر سنانا۔۔دوم تعلیمِ کتاب اور اس کی حکمت۔۔۔سوم تزکیۂ نفوس واخلاق۔۔۔ذیل

میں تینوں اجزاء پر قدرے تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

تلاوت کا معنی تو اتباع اور پیروی کے ہیں۔قرآن وحدیث کی اصطلاح میں تلاوت صرف قرآن کریم اور دوسری آسمانی کتابوں اور کلام الٰہی کے پڑھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کے پڑھنے والے کو اس کا پورا اتباع کرنا لازم ہے کہ جس طرح وہ نازل ہوا ہے ٹھیک اسی طرح پڑھنا ضروری ہے، اپنی طرف سے کسی لفظ یا حرکات میں کمی بیشی یا تبدیلی کی اجازت نہیں۔امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ کلام الٰہی کے سوا کسی دوسری کتاب یا کلام کے پڑھنے کو عرفاً تلاوت نہیں کہا جاسکتا۔آیت شریفہ میں تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے اور تعلیم کا معانی سے۔

آیت شریفہ میں تعلیم کتاب سے تلاوت آیات کو علیٰحدہ فرض اور مقصد قرار دیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح قرآن عظیم کے معانی مقصود ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں، کیوں کہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے، معانی کی نہیں، اسی لیے جس طرح رسول کے فرائض میں معانی کی تعلیم داخل ہے اسی طرح الفاظ کی تلاوت وحفاظت بھی ایک مستقل فرض ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے، محض اس کے الفاظ رٹ لینے پر قناعت کر کے بیٹھ جانا قرآن کریم کی حقیقت سے بے خبری اور اس کی ناقدری ہے۔

اور تعلیم کتاب کو علیٰحدہ بیان کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ صرف عربی زبان کا جان لینا کافی نہیں بل کہ تعلیم رسول اور تعلیم حکمت کی بھی ضرورت ہے، جس طرح دیگر علوم وفنون میں یہ ہے کہ کسی فن کی کتاب کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے محض اس کتاب کی زبان جان لینا بل کہ اس

کا ماہر ہوجانا بھی نا کافی ہے جب تک اس فن کو کسی ماہر استاذ سے حاصل نہ کیا جائے۔ مطلب تعلیم استاذ کی ضرورت ہے۔ تو اسی طرح مضامین قرآن جو علوم الٰہیہ سے لے کر طبعیات وفلسفہ تک تمام دقیق علوم پر مشتمل ہیں وہ محض عربی جان لینے سے کیسے حاصل سکتے ہیں۔ لہٰذا تعلیم کتاب کو جداگانہ فرض قرار دے کر بتلا دیا کہ فہم قرآن کے لیے عربی زبان جان لینے والوں کے لیے بھی تلاوت آیات کا سن لینا کافی نہیں بل کہ اسکے ساتھ تعلیم رسول کی بھی ضرورت ہے کہ تعلیم رسول ہی کے ذریعہ قرآنی تعلیم کا صحیح علم حاصل ہوسکتا ہے۔

تعلیم کتاب کے ساتھ آپ کے فرائض میں دوسری چیز تعلیم حکمت بھی ہے۔ حکمت کے عربی زبان کے اعتبار سے کئی معانی ہیں۔ مفسرین صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم نے مختلف الفاظ سے حکمت کی تفسیر وتشریح کی ہے تاہم خلاصہ سب کا ایک ہی ہے یعنی سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ سنت رسول سے تفسیر کرنے سے واضح ہوگیا کہ رسول کے ذمہ جس طرح معانیٔ قرآن کا سمجھانا فرض ہے اسی طرح پیغمبرانہ تربیت کے اصول وآداب جن کا نام سنت ہے ان کی تعلیم بھی آپ کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

نیز آپ نے فرمایا اِنَّمَا بُعِثتُ مُعَلِّمًا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور جب آپ معلم ہیں تو آپ کی امت کا مقصد تعلّم وطالب علمی ہوئی، اس لیے ہر مسلمان مرد وعورت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے اگر پوری تعلیم کی ہمت نہ ہوتو بقدر ضرورت تو ضرور حاصل کرنی چاہیے۔

تیسرا فرض تزکیہ ہے جس کے معنی ظاہری وباطنی نجاسات سے پاک کرنا ہے۔ ظاہری نجاسات سے تو ایک عام مسلمان بھی واقف ہے۔ البتہ باطنی نجاسات سمجھ لیں۔ وہ کفر وشرک،

غیر اللہ پر کلی اعتماد اور فاسد عقائد اور تکبر وحسد، بغض وحب دنیا وغیرہ ہیں۔ اگر چہ علمی طور پر قرآن وسنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آچکا ہے لیکن تزکیہ آپ کا جداگانہ فرض قرار دے کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح نظری وعلمی طور پر فن حاصل ہو جانے سے اس کا استعمال اور اس کا کمال حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک کسی مربی کے زیر نظر مشق کر کے اس کی عادت نہ ڈالے۔ سلوک وتصوف میں شیخ کامل کی تربیت کا کام بھی یہی ہے کہ قرآن وسنت میں جن احکام کو علمی طور پر بتلایا گیا ہے ان کی عادت عملی طور پر ڈالے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے از اول تا خاتم النبیین ﷺ انسانوں کی ہدایت واصلاح کے دو سلسلے جاری رکھے ہیں۔ ایک آسمانی کتابوں کا۔ دوسرے اس کی تعلیم دینے والے رسولوں کا۔ اس کے لیے محض کتاب نازل فرمادینے کو جس طرح کافی نہیں سمجھا، اسی طرح محض رسولوں کو بھیجدینے پر بھی اکتفا نہیں فرمایا بل کہ دونوں سلسلے برابر جاری رکھے۔

اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ انسانی صحیح تعلیم وتربیت کے لیے نہ صرف کتاب کافی ہے نہ کوئی مربی انسان۔ بل کہ ایک طرف آسمانی کتاب کی ضرورت ہے تو دوسری طرف معلم ومربی انسان کی بھی ضرورت ہے۔ کیوں کہ انسان کا اصل معلم انسان ہی ہوسکتا ہے۔ خود کتاب معلم ومربی نہیں ہوسکتی، ہاں وہ تعلیم وتربیت میں معین ضروری ہوسکتی ہے۔ یعنی کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں ضروری ہیں۔ (معارف القرآن ۱/۲۷۲)۔ یہ تھے مقاصد نبوت، اللہ تعالیٰ ہمیں وراثت کے ناتے مقاصد نبوی کی تعمیل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وارثین انبیاء ”علماء“ سے کون مراد ہیں؟ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

وارثین انبیاء وہ ہیں جن میں علم وعمل کی دونوں خوبیاں ہوں، کہ جتنا علم اتنا عمل اور جتنا عمل اتنا علم بھی یعنی یہ تمیز مشکل ہو کہ علم زیادہ ہے کہ عمل۔

اور وہ دونوں فضیلتوں یعنی کمال وتکمیل کے بھی جامع ہوں وہ ہے تعلّم وتعلیم یعنی خود بھی علم حاصل کر کے اپنے اندر کمال پیدا کر لے اور دوسروں کو بھی تعلیم دے کر ان کو کامل بنائے۔ نہ اپنے اندر کے جہل سے راضی ہو نہ دوسروں کے جہل سے راضی۔ یہی لوگ راسخین فی العلم ہیں جو وارثین انبیاء ہیں۔ (طیبی ۱۱/۳۷۲۳) لہٰذا فضلیت وتکمیل کے ناتے ائمہ حضرات کو مقتدیوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ کرنی چاہیے۔

(۳) منصب امامت تمام منصبوں سے بلند ہے

دین اسلام میں جتنی عبادتیں ہیں ان میں سب سے افضل عبادت نماز ہے۔ نماز تمام اعمالِ اسلامیہ کا معجون مرکب ہے۔ جس میں تمام عبادتوں کی کچھ نہ کچھ جھلک ضرور ہے۔ نماز وہ عبادت ہے جسے عطا کرنے کے لیے اللہ جل شانہ نے اپنے بندے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شب معراج میں اپنے پاس بلایا، اور اس کی باقاعدہ تعلیم کے لیے سید الملائکہ حضرت جبرئیل امین کو نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا، انہوں نے باقاعدہ امامت کے ذریعہ نماز کی پوری تعلیم دی۔ اس سے نماز اور امامت کی عظمت واہمیت واضح ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تادم حیات اس منصب کو سنبھالا اور دنیا سے رخصت ہونے کے وقت منصب امامت کے لیے ایک ایسی جامع شخصیت کا انتخاب فرمایا جو نہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بل کہ انبیاء ورسل علیہم السلام کے بعد تمام انسانوں میں بھی افضل ہے یعنی صدیق اکبرؓ۔ تمام خلفاء راشدین نے خلافت کے فرائض کے ساتھ امامت کے

منصب کو بھی سنبھالا بل کہ ان کے دور میں جو بھی گورنر بنایا گیا اس نے بھی اس کے ساتھ منصب امامت کو ضرور سنبھالا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ منصب امامت ایک عظیم منصب ہے۔

لہٰذا ائمہ حضرات کو اپنے اس عالی منصب سے واقف ہو کر اس کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورے کرنے چاہیے اور انہیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ دین کے خادم ہیں اور یہ تصور کبھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ایک تنخواہ دار ملازم ہیں۔

(۴) امامت کی دو قسمیں

امامت کے دو مصداق ہیں یا اس کی دو قسمیں ہیں۔

مصداق اول حاکم وقت کی امامت جسے امامت کبریٰ کہتے ہیں یہی قسم اول ہے۔

مصداق ثانی امام صلوٰۃ کی امامت جسے امامت صغریٰ کہتے ہیں یہی قسم ثانی ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عبید اللہ بن عدی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں محصور تھے تو حضرت عبید اللہ نے فرمایا کہ اس وقت امام عام (خلفیہ وحاکم) تو آپ ہی ہیں لیکن جس مصیبت سے آپ دوچار ہیں وہ آپ خود بھی جانتے ہیں (گھر میں محصور ہیں) اور (مسئلہ یہ ہے کہ) ہمیں باغیوں کا امام نماز پڑھا رہا ہے جس کے پیچھے نماز پڑھنے میں ہم حرج (نامناسب وخطا) سمجھتے ہیں (تو اس بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟) (مشکوٰۃ ۶۲)۔

مذکورہ حدیث سے دونوں طرح کی امامت کا بیان ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس وقت امام عام تو آپ ہی ہیں، لیکن نماز ہمیں باغیوں کا امام پڑھاتا ہے (اِنَّكَ اِمَامُ عَامَّةٍ، وَيُصَلِّي لَنَا اِمَامُ فِتْنَةٍ) [1]۔

[1] منصب امامت اور امامت کی قسموں کو ہم حصہ اول میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

(۵) معیاری ائمہ

قرآن کریم کا ارشاد ہے "وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيٰتِنَا يُوقِنُونَ" (سجدہ ۲۴) مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ میں ائمہ سے مراد بنی اسرائیل کے بعض علماء ہیں۔ اور روح المعانی میں ہے کہ جن کو ائمہ بنانے کی بشارت دی ہے وہ یا تو انبیاء بنی اسرائیل ہیں یا غیر انبیاء ہیں کہ وہ خیر و بھلائی میں سردار و امام ہوں گے جیسا کہ حضرت قتادہؒ سے نقل کیا ہے۔ اگر غیر انبیاء مراد ہیں تو حکم (امر) سے مراد امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ انجام دینے میں (جس کی طرف اس آیت شریفہ "وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ" (آل عمران ۱۰۴) میں اشارہ کیا گیا ہے) ان کی تعریف ہے اور فلاح کا مژدہ ہے۔ اور خلاصہ کے طور پر لکھا ہے کہ "لَجَعَلْنٰكَ هُدًى لِاُمَّتِكَ وَلَنَجْعَلَنَّ مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ مِثْلَ تِلْكَ الْهِدَايَةِ" (روح المعانی ۲۱/۱۸۵)۔ ترجمہ: (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے نبی) ہم آپ کو اپنی امت کے لیے (ذریعہ) ہدایت بنائیں گے اور ہم انہیں میں سے بعض کو ایسے پیشوا بنائیں گے جو نبی کی راہ نمائی کی طرح (لوگوں کی) راہ نمائی کریں گے۔ اور معارف القرآن میں خلاصہ تفسیر میں لکھا ہے اس آیت شریفہ میں مؤمنین کو دنیوی تسلی ہے کہ اگر تم لوگ بھی یقین کے ساتھ صبر کرتے رہو گے تو ہم تم کو بھی ائمہ دین بنا دیں گے۔ (معارف القرآن ۷/۷۲)۔ نیز مفسرینؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں ائمہ کی دو شرطوں کا بیان ہے صبر و یقین۔ اس آیت شریف پر مزید تفصیل حصہ اول میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح کا مضمون سورۃ قصص میں موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کے بارے میں بھی بیان ہوا ہے "وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ" (قصص ۵)

(۶)علماء(وائمہ) پرعوام کی اصلاحی ذمہ داری

" یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا أَطِیْعُوْا اللہَ وَأَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَأُوْلِی الْأَمْرِ مِنْکُمْ " (سورۃ النساء ۵۹)۔اے ایمان والو،اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو اس کے رسول کی اور ان کی جو تمہارے معاملات کے ذمہ دار ہیں۔معاملات کے ذمہ دار سے مراد کون ہیں؟تو مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس،مجاہد اور حضرت حسن بصری۔رحمہا اللہ تعالیٰ۔نے اس کا مصداق حکام اور علماء وفقہاء کو قرار دیا ہے۔کیوں کہ حکم شرعی کو لوگوں میں رائج کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ایک جبر وتشدد۔دوسری اعتماد واعتقاد۔اول حکاموں کا وظیفہ ہے کہ وہ اپنی قوت وطاقت کے ذریعہ لوگوں کو شرعی احکام پر چلاتے ہیں۔اور ثانی علماء(وائمہ) کا وظیفہ ہے۔

کیوں کہ عوام الناس علماء پر اعتماد کرتے ہیں۔کیوں کہ ان سے بذریعہ اعتماد واعتقاد حکم شرعی رائج ہونے کا مشاہدہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے کہ دینی معاملات میں عام مسلمان اپنے اختیار سے علماء ہی کے حکم کو واجب العمل سمجھتے ہیں۔(معارف القرآن۔۲/۴۵۰و۴۹۲)۔لہٰذا علماء وائمہ کو چاہئے کہ عوام کو اپنے اخلاق وکردار سے اپنے اعتماد لیں پھر انہیں شرعی احکام اور دین پر چلائیں حتی کہ حضرت مفتی **محمد شفیع** صاحبؒ نے تو اس پر یہ عنوان قائم کیا ہے کہ علماء پر عوام کی اصلاح کی ذمہ داری ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت احوص رحمہ اللہ تعالیٰ کی طویل روایت " لَاتَسْئَلُوْنِیْ عَنِ الشَّرِّ " کہ مجھ سے شر کی باتیں نہ پوچھو،کی تشریح میں لکھا ہے کہ بروں میں سب سے برے اور اچھوں میں سب سے اچھے علماء ہیں۔علماء اس لیے سب سے اچھے یا سب سے برے ہیں کہ دینی ودنیاوی صلاح وفساد کا مدار وہی ہیں۔کیوں کہ نظام دنیویہ کی درستگی اس وقت

تک ہے جب تک علماء درست ہوں اور جب ان میں فساد آتا ہے تو دنیا میں بھی فساد آجاتا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ اسی وجہ سے ''اولی الامر'' کی تفسیر ''علماء'' سے کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ دین کی حفاظت کرنا اولی الامر کا وظیفہ ہے (طیبی ۱/ ۴۱۴)۔

غور تو کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان علماء (وائمہ) کی اطاعت کو کیسا عظیم شرف بخشا ہے کہ ان کی اطاعت کو اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کے ساتھ جوڑا۔ تو پھر ان علماء وائمہ کو'' اللہ ورسول'' کی اطاعت کس درجہ کرنی چاہیے۔ اور انہیں کیسی زندگی گزارنی چاہیے۔ جب ایک دلہا بھی بارات میں چلتا ہے تو اپنے مقام کا لحاظ کرتے ہوئے صرف چند لوگوں کی نظروں کے خاطر کہ وہ اس کو دیکھ رہے ہیں دائیں بائیں التفات نہیں کرتا اور چال چلن میں پوری احتیاط برتتا ہے۔ تو ہم اپنی زندگی میں اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاطر اتنی تبدیلی نہیں لاسکتے کہ سب ہی لوگ سمجھ لیں کہ واقع میں ہم محتاط زندگی گزار رہے ہیں۔

(۷) برتر علماء (ائمہ) کی برتری صاحب شریعت کی زبانی

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْاَشْجَعِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ ۔ (مشکوۃ ۳۱۹)۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمہارے بہترین ائمہ وہ ہیں جنہیں تم محبوب رکھو اور وہ (بھی) تمہیں محبوب رکھیں اور تم ان کی نماز (جنازہ) پڑھو اور وہ بھی تمہاری نماز پڑھیں۔ اس حدیث شریف میں صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ائمہ کو خیر وبرتر فرمایا ہے جو دین وشریعت پر چل کر اصول دین کے مطابق امامت کر کے لوگوں کی نظروں میں محبوبیت کا درجہ حاصل کرلیں۔ اللہ اکبر۔ کیا مقام ہے؟!! ان ائمہ کا جن کو دربار رسالت اور لسان نبوت سے یہ بشارت حاصل ہے۔

کیااس نعمت کا مقابلہ دنیوی کوئی نعمت کرسکتی ہے ؟؟؟علمائے حدیث فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں محبت سے مراد وہ دینی محبت ہے جوشرعی ضابطہ کےتحت ہویعنی ائمہ پرمقتدیوں کے ناتے جوذمہ داریاں عائد ہیں انہیں اچھی طرح ادا کریں جن سے مقتدی حضرات خوش ہوں۔ذاتی یااغراض فاسدہ کےتحت برتی جانے والی محبت مرادنہیں۔لہٰذا شرعی ودینی محبت کے اسباب اختیارکرنے کے باوجودکوئی محبت نہ رکھےاورناخوش ہوتو یہ مقصد کے لیےمضرنہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر وہ اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی کریں جس سے مقتدی ناخوش ہوں تومقتدی حق بجانب کہلائیں گے۔اس صورت میں ائمہ اس فضیلت کے مستحق نہ ہوں گے بل کہ مستحق وعید ہوں گے جواس کے بعد حدیث شریف میں مذکور ہے۔لہٰذا ائمہ حضرات کو طریقۂ امامت میں مقتدیوں کے ساتھ اچھا اور مضبوط تعلق رکھنا چاہیے اورمقتدیوں کے ساتھ شفقت ونرم مزاجی اختیارکرنی چاہیےاورحکمت سےانہیں امر بالمعروف ونہی عن المنکرکرتے رہنا چاہیے۔

(۸) امیر(امام) کی اطاعت پر بشارت،اورنافرمانی پروعید

عَنۡ اَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ مَنۡ اَطَاعَنِیۡ فَقَدۡ اَطَاعَ اللهَ وَمَنۡ عَصَانِیۡ فَقَدۡ عَصَی اللهَ، وَمَنۡ یُّطِعِ الۡاَمِیۡرَ فَقَدۡ اَطَاعَنِیۡ وَمَنۡ یَّعۡصِ الۡاَمِیۡرَ فَقَدۡ عَصَانِیۡ ۔(مشکوٰۃ ۳۱۸)۔حضورصلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اورجس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اورجس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اورجس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

حدیث شریف میں تین باتوں کی طرف اشارہ ہے۔(۱) مسلمانوں کواپنے امیروں کی

اطاعت کا مقام ورتبہ بتانا کہ امیر کی اطاعت درحقیقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہے اور یہی معاملہ نافرمانی کا بھی ہے۔ کیوں کہ خیر وشر کا ضابطہ یہ ہے کہ ہر چھوٹی خیر بڑی کا اور ہر چھوٹا شر بڑے شر کا دروازہ اور ان کا ذریعہ ہے۔ (۲) مسلمانوں کو اپنے امیر کی اطاعت پر آمادہ کرنا۔ (۳) اتحادی طاقت پیدا کرنا۔

اور ائمہ حضرات بھی مجازاً امیر کے حکم میں ہیں تا کہ اسلامی نظام استحکام حاصل کر کے شہر وقصبہ اور دیہات ترقی کریں بشرطیکہ ائمہ حضرات بھی اپنے پر عائد ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ انجام دیں۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ...وَاَطِیْعُوا ذَا اَمْرِکُمْ تَدْخُلُوا جَنَّۃَ رَبِّکُمْ (مشکوۃ ۵۸)۔ یہ ایک طویل حدیث شریف کا ٹکڑا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اپنے معاملات کے ذمہ دار کی اطاعت بجالاؤ گے تو تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہوگے۔ ذاامرکم سے مراد مسلمانوں کے امور کا ذمہ دار والی اور حاکم وقت ہے یا وہ علماء (وائمہ) ہیں جو حاکم وقت کی طرف سے اصلاح ناس اور اسلامی نظام سنبھالنے پر مقرر ہوں۔

چوں کہ ائمہ مساجد بھی اپنے شہر اور گاؤں وغیرہ میں لوگوں کے مہتم بالشان امور مثلا نماز، جمعہ، عیدین، تراویح، نکاح وجنازہ اور اصلاح بین الناس وغیرہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں خصوصًا جہاں اسلامی ریاست نہ ہو۔ اس لیے مذکورہ اطاعت کا حکم مجازًا ان سے بھی متعلق ہوگا۔ کیوں کہ یہ اطاعت محلہ کے امام کی نہیں اصل اطاعت تو رسول کی ہے محلہ کا امام اس کا ذریعہ ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ائمہ حضرات کو بطور خاص عقائد وعبادات میں اور ریاضت ومجاہدہ، گفتار وکردار اور اطوار وعادات میں شرعی ضابطوں کے مطابق نمونہ بن کر رہنا چاہیے تا کہ ان کے نقش قدم کا اتباع کیا جائے۔ اس پر مزید تفصیل حصہ اول میں مذکور ہے۔

(۹) امام اپنے ماتحتوں کا نگراں اور ان کا ذمہ دار ہے

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ .... يَقُوْلُ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ فَالْاِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔ (بخاری شریف ۱/۳۴۷)۔ یہ طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اپنی (اپنی) رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا، اور امام لوگوں کا نگہبان ہے اس سے (بھی) اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

مذکورہ حدیث گرامی سے صراحتاً معلوم ہو رہا ہے کہ امام اپنے ماتحتوں کا ایسا ذمہ دار ہے کہ اس ذمہ داری کے بارے میں روز قیامت میں جہاں اس سے اپنے ذاتی اقوال وافعال کے بارے میں باز پرس کی جائے گی وہاں اس سے مزید سوال یہ بھی ہوگا کہ تم نے اپنی رعیت کے بارے میں جن امور کا تمہیں مکلف کیا گیا تھا کیا ذمہ داری انجام دی؟ یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ ہم نے مجازاً امام نماز پر ان جیسی احادیث کو محمول کیا ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو حصہ اول میں مذکور ہے۔

(۱۰) امامت اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے

ائمہ حضرات کا زمام امامت کا مالک ہونا درحقیقت رب کریم کی خصوصی نوازش اور رسول کریم کا ناقابل فراموش احسان وانعام ہے۔ یہ دین کی عظیم المرتبت خدمت ہے اور رب ذوالجلال کی رضا وخوشنودی کا خاص سبب ہے۔ حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (لاجپوری) فرماتے ہیں کہ اسلام میں منصب امامت کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ مصلیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مصلیٰ ہے اور امام نائب رسول ہوتا ہے۔ کسی نعمت کے قدر دانوں کو اس نعمت کے زوال

پر کیا گزرتی ہے، اس کا ضمیر کن مشقتوں سے دو چار ہوتا ہے اس کا اندازہ ایک جلیل القدر محدث شیخ عبدالرزاق (صاحب مصنف عبدالرزاق) رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس واقعہ سے سمجھئے۔

وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ مکہ المکرمہ پہنچا تو کچھ طالبان حدیث اخذ حدیث کے لیے جمع ہو گئے۔ ایک مرتبہ وہ طلبہ حاضر درس نہ ہوئے تو مجھ پر بڑا شاق گزرا اور مجھے مختلف خیالات نے آگھیرا کہ شاید میری یہ کوتاہی یا فلاں کوتاہی کی وجہ سے طلباء حاضر نہ ہوئے ہوں۔ مثلا: میں فن حدیث میں ناقص العلم ہوں یا اصول حدیث کا فلا عیب، مثلا عدم ضبط، قلت عدالت وغیرہ مجھ میں موجود ہو۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جس کے بعد طلباء دوبارہ حاضر درس ہوئے تب مجھ میں دم آیا۔ (تاریخ یحیی بن معینؒ ار ۲۳)۔ ایک معلم کے لیے طلباء کا ملنا کتنی بڑی نعمت ہے اسے عاشقان علم اور علم کے قدرداں ہی جانتے ہیں۔

بس اسی طرح مقتدیوں کا نماز میں آنا بھی کتنی بڑی نعمت ہے!! اسے امامت کے قدرداں اور وہ لوگ جانتے ہیں جو نمازیوں کو جمع کرنے کے لیے تڑپتے اور ان کو مسجد لانے کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ جس کے لیے باقاعدہ انہیں سمجھانے کے لیے گھروں بازاروں کھیتوں وغیرہ پر جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو لوگوں کی دینی فکر ہے

(۱۱) امامت کا حاصل ہونا بھی ایک امتحان ہے

ائمہ حضرات اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ امامت جس طرح ایک نعمت خداوندی ہے اسی طرح وہ ان کے حق میں امتحان بھی ہے۔ مفسر قرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے آیت شریفہ "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ" (اعراف ۱۲۸)۔

ترجمہ: (بلا استحقاق غیر) ساری زمین اللہ تعالیٰ کی ملک ہے وہ جسے چاہے اپنے بندوں میں

سے اس کا وارث بناتے ہیں۔ کے تحت لکھا ہے کہ

درحقیقت حکومت وسلطنت اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ انسان کو جو حکومت (بحیثیت خلافت) عطا کرتا ہے وہی عطا کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اسے چھین لیتا ہے۔ "تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ" زمین پر جس کسی کو چاہے فرد ہو کہ جماعت جو حکومت عطا کی جاتی ہے وہ درحقیقت اس کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ مقصد حکومت (قیام عدل اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کو کس حد تک بجالاتا ہے۔ (معارف القرآن ۴/۴۲) ۔بس اس پر امامت کے عظیم منصب کو بھی قیاس کر لیجئے۔

تنبیہ : ائمہ حضرات کے مقام ومرتبہ کے بیان کے ذیل میں ایسی نصوص پیش کرنا بھی مناسب ہے جو انہیں اپنے منصب میں برتی جانے والی کوتاہوں پر متنبہ کرنے والی ہوں۔ کہ یہی طرز قرآن عظیم کا ہے کہ اس میں وعدوں کے ساتھ وعیدوں کو جنت کے تذکروں کے ساتھ جہنم کے تذکروں کو جوڑا گیا ہے اور "وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنَ الْأَشْيَاءُ" ضابطہ بھی اس کی تائید کرتا ہے ۔لہٰذا وعیدوں پر مشتمل نصوص بھی مختصراً ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۲) قرآن کی نظر میں برے علماء

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ" (مائدہ ۶۳) ۔ان (اہل کتاب) کے مشائخ اور علماء ان (کے عوام) کو گناہ کی بات کہنے اور حرام غذا کھانے سے کیوں نہیں روکتے بہت ہی برے اعمال ہیں وہ جو (خواص) اختیار کر رہے ہیں۔ روح المعانی اور معارف القرآن میں ہے کہ ربانیون سے مراد اہل کتاب کے بڑے مشائخ اور ان کے وہ علماء ہیں جو عوام الناس کی اصلاح پر

حکومت کی جانب سے مامور ہوں اور صاحب اقتدار ہوں۔ اور احبار سے وہ علماء مراد ہیں جو اصلاح ناس پر مامور تو ہوں لیکن صاحب اقتدار نہ ہوں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ اس آیت شریفہ میں یہود کے مشائخ وعلماء کو سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنا فرض منصبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیوں چھوڑ بیٹھے! وہ قوم کو مختلف برائیوں سے روکتے کیوں نہیں، قوم کو ہلاکت کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں پھر بھی ان کو کیوں نہیں روکتے حالاں کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے۔

یہ اگرچہ اہل کتاب کے علماء کے بارے میں ہے لیکن قرآن عظیم میں اس کا ذکر کر کے امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علماء کو اس سے آگاہ کرنا ہے تاکہ ان کا بھی حال ایسا نہ ہو۔

جیسے اوپر مذکور ہوا کہ یہ ذمہ داری حکام وعلماء دونوں پر ہے۔ غور کیجئے کہ اسلامی حکومت ہوتے ہوئے بھی جب حکام وعلماء کو اصلاح کا ذمے دار ٹھہرایا جا رہا ہے اب اگر نہ اسلامی حکومت ہو یا نہ من جانب حکومت اصلاح پر کوئی مامور ہو جیسے ملک ہند وغیرہ وہاں اصلاح کی ضرورت کتنی بڑھ جائے گی۔ تو پھر علماء پر وہ ذمہ داری کتنی احتیاج سے عائد ہوگی۔ بایں وجہ حضرت مفتی صاحب نے یہاں لکھا ہے کہ درحقیقت قوم وملت کی اصلی روح اگر ہے تو وہ حق پرست علماء ومشائخ ہیں۔ ان کا وجود قوم کی حیات ہے اور ان کا فقدان موت ہے۔

اس آیت شریفہ میں علماء ومشائخ کی تنبیہ میں "لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ" فرمایا گیا ہے اور اس سے پہلے کی آیت شریفہ جس میں اہل کتاب کے عوام کے جرائم کا ذکر ہے اس میں "لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ" فرمایا گیا ہے۔ مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے یصنعون اور یعملون کے فرق کو اس طرح بیان کیا ہے کہ فعل تو ہر کام کو شامل ہے، خواہ باقصد ہو کہ بلا قصد اور عمل صرف اس کام کے لیے بولا جاتا ہے جو بالقصد والارادہ کیا جائے، اور صنع اس کام کو کہتے ہیں جس کو بطور مقصود وعادت کے کیا جائے اور اس کو بارہا بطور عادت اور مقصد کے درست کر کے

کیا جائے۔

تو اب آیت کا مفہوم واضح ہو گیا کہ ان مشائخ وعلماء کا عوام کو برائیوں سے نہ روکنا جس طرح بالارادہ ہوتا تھا اس طرح وہ بطور مقصود بھی ہوتا تھا۔ اور وہ مقصد یہ ہوتا تھا کہ اگر ان کو برائیوں سے روکا تو ان سے وابستہ اغراض یعنی مال ودولت حاصل ہونے کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ (معارف القرآن ۳/۱۸۶)

(۱۳) داعی الی النار ائمہ قرآن کی زبانی

"وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنْصَرُونَ" (قصص ۴۱)۔

اور ہم نے ان کو (اُن کا) پیشوا بنایا جو جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور قیامت کے روز ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ آیت شریفہ میں فرعون کے درباریوں کا ذکر ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کا پیشوا بنا رکھا تھا اور انہیں ان کے عوام پر سربراہی عطا کر رکھی تھی تا کہ اپنے اس منصب کے ذریعہ لوگوں کی صحیح راہ نمائی کریں اور باطل سے ہٹا کر حق کی طرف لائیں۔ لیکن حق کی جانب راہ نمائی کے بجائے باطل کی طرف راہ نمائی کرنے لگ گئے۔

اس پر غور کیجئے کہ جو لوگ اصلاح کے ذمے دار تھے اور انہوں نے اس ذمے داری سے اعراض کیا تو قرآن شریف نے ان کو کیا کہا یہی نا کہ وہ داعی الی النار ائمہ ہیں۔ نعوذ باللہ۔ کتنی شدید وعید ہے۔

(۱۴) قوم کے بدتر سربراہوں کی عبرت ناک سزا

قرآن شریف کا ارشاد ہے "وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ○ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ○" (احزاب ۶۷، ۶۸)۔

وہ (کافرین وغیرہ) کہیں گے اے ہمارے پروردگار ہم نے تو اپنے سرداروں کی اطاعت کر رکھی تھی اور اپنے بڑوں کی بات مان رکھی تھی پھر انہوں نے تو ہمیں راہِ (راست) سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے پروردگاران (سرداروں) کو دگنے عذاب میں مبتلا فرمایئے اور ان پر آپ بڑی لعنت وفٹکار برسایئے۔

ان مذکورہ تمام آیتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر پر نازل فرما کر اگلے زمانہ کی قوموں کے ائمہ، سادات علماء وسرابراہوں کے برے اعمال اور ان کے نتائج کا ذکر فرمایا ہے تا کہ اپنے حبیب ﷺ کی امت کے علماء ومشائخ اور ائمہ کا وہ براحشر اور براانجام نہ ہو جو ان کا ہوا۔ بل کہ وہ اپنے ماتحت افراد کی صحیح راہ نمائی کریں اور ان کی اصلاح کریں۔ تا کہ ان آیتوں کے نازل کرنے کا مقصد بھی حاصل ہو اور ان میں بیان کردہ بشارتوں کے وہ مستحق بھی ہوں۔ لہٰذا ائمہ وعلماء حضرات کو چاہیے کہ وہ اپنی ذمے داریوں کو نبھائیں۔ اور یہ وہی کر سکتا ہے جس کو اپنے نبی سے سچی محبت ہو کہ نبی سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے دین کی جڑوں کو مضبوط بنائیں۔

ورنہ محبت کوئی ایسی چیز نہیں جس کو زبان سے ظاہر کیا جائے وہ باطنی کیفیت ہے البتہ اس کا قاعدہ جس سے محبت اور عدم محبت کا راز عیاں ہو جاتا ہے یہ ہے۔ ”اَلْمُحَبَّةُ عَلٰی قَدْرِ الْمُتَابَعَةِ، وَالْمُتَابَعَةُ عَلٰی قَدْرِ الْمُحَبَّةِ“ جتنی محبت اتنی اس کی اتباع، اور جتنی اتباع اتنی محبت۔ سبحان اللہ کیا بلند معیار ہے!!

اللھم ارزقنا حبہ وحب اصحابہ واتباعہ علی قدرھا۔

یَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

خاتمۂ کتاب

ذیل کی تحریرات کو ائمہ بغور ملاحظہ فرمائیں جو بڑے مصنفین کی جانب سے لکھی گئی ہیں۔ مثلاً حضرت مولانا عبدالحی کفلیتویؒ حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ، حضرت مولانا ظفیر الدین نوڈیہاوی، حضرت مفتی ابوناصر مظاہری اور حضرت مفتی احمد بیمات صاحب وغیرہ۔

حضرت مفتی احمد بن ابراہیم بیمات صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا عبدالحی کفلیتویؒ نے لکھا ہے کہ آج کل ائمہ کی لیاقت کا ناپ وتھرمامیٹر (معیار) متولیان کی خوشامد کرنا بن گیا ہے۔ ائمہ چاہے نااہل ہوں لیکن وہ متولیوں کی خوشامد کر کے ان کے مقرب ومحبوب بن جاتے ہیں اور متولی لوگ بھی ایسے ائمہ کا تقرر کرتے ہیں جو ان کی خوشامد کریں کیوں کہ ان کو ایسے خوشامدی ائمہ اچھے لگتے ہیں اور جو کام امامت سے مطلوب ہیں وہ فوت ہو جاتے ہیں حالاں کہ یہ منصب امامت کے ساتھ مزاق ہے اور یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ (احکام المساجد ۱۳۳)۔

حضرت مفتی احمد بیمات صاحبؒ نے جناب الحاج مفتی ابوناصر مظاہری کے حوالے سے لکھا ہے کہ کتنی تکلیف کی بات ہے!! کہ آج ہمارے مذہبی پیشواؤں میں تقویٰ، پرہیزگاری بہت کم نظر آتی ہے وہ اِس قیمتی دولت سے کورے نظر آتے ہیں۔۔۔ بہت سے ائمہ کرام تو اپنے ذاتی مفاد کے خاطر ہر وقت ذمے داروں کی خوشامدوں میں لگے رہتے ہیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسے اہم فریضہ سے بے پرواہ اور غافل ہو کر معاشی فکر میں ایسے لگ جاتے ہیں کہ حلال وحرام کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ ہمارے اس طرح کے کام ہی لوگوں کی نظروں سے ہماری عزت ختم کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ائمہ مساجد (جو درحقیقت راہ نما اور مقتدی بنانے کے لائق

ہیں)ایک ادنی ملازم ونوکر شمار ہوتے ہیں۔(احکام المساجد ۱۳۶،۱۳۷)

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ ائمہ کرام کو اپنی علمی کمی اور کمزوری کو دور کرنے میں بےفکر نہیں رہنا چاہیے۔سب سے پہلے تو قرآن شریف کو صحیح صحیح پڑھنا سیکھیں،بعضوں کی تو سورۂ فاتحہ بھی صحیح نہیں ہوتی،بعض اپنے حسن صوت کی وجہ سے جہلاء کی تعریفات سن کر خود کو بڑا قاری سمجھنے لگتے ہیں حالاں کہ سینکڑوں غلطیاں ہوتی ہیں،اگر صحت کی طرف دھیان نہ دیا تو ہم سب گنہگار رہوں گےان کا اس حالت میں امامت کرنا بالکل جائز نہ ہوگا۔

نیز اپنے اندر خوفِ خدا پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔امامت سے کسب دنیا کی نیت ناپاک جرأت ہے۔ایسی گندی چیزوں کو دلوں سے نکال کر اخلاص وللّٰہیت سے امامت کرنے کی ضرورت ہے۔یہ سمجھ کر پنج وقتہ امامت کرنا کہ تنخواہ تو حاصل ہو ہی جائے گی پھر بےفکری سے بقیہ اوقات لایعنی کاموں میں گذار دینا کسی بھی طرح درست نہیں۔ (ایضاً ۱۳۸)

حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ جس قوم کے راہ نما علمی وعملی گمراہیوں میں پھنسے ہوئے ہوں وہ قوم کیسے راہ راست پر آسکتی ہے؟؟ لہٰذا میں ان سے مؤدبانہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ محض خدا کے لیے اپنی علمی وعملی اصلاح فرمادیں اسی میں ہماری اور مسلم قوم کی خیر وبھلائی ہے۔اور اگر وہ اپنی اصلاح نہیں کرتے اور اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے تو پھر خدا کے واسطے دین کو بربادی سے بچانے کے لیے اور مذہبی پیشواؤں کی عزت برقرار رکھنے کے لیے امامت کے عہدے سے دست بردار ہوجائیں اسے ذلیل نہ کریں۔

اور یہ خیال ہرگز نہ کرنا کہ امامت چھوڑ دیں گے تو کھانا کہاں سے کھائیں گے،کیوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی روزی کا بہتر انتظام فرمادیں گے تھوڑی سی صبر سے کام لینا ہوگا،اور اس

امامت کو چھوڑ دینے کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان لوگ اس عہدے کے مناسب امام کو تلاش کرلیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ منصب امامت کو اس کے اہل میسر ہوں گے اور پھر امامت کی اصلاح کا بڑا راستہ کھل جائے گا[1]۔ (ایضاً ۱۴۰)

نوٹ : ائمہ کو یہ بھی بتانا چاہیں گے کہ جس طرح ہم آپ ائمہ پر قوم کی اصلاحی ذمہ داری ڈال رہے ہیں اور قوم کے اصلاحی امور کے لیے آپ کی اور آپ کے وجود کی تشکیل

[1] حضرت نے واقعی بڑی عمدہ بات لکھی، لکھی نہیں بل کہ اللہ تعالیٰ نے لکھائی کیوں کہ آج کچھ عمدہ اور اہل ائمہ موجود ہیں لیکن انہیں منصب امامت پر لانے کا موقع نہیں ہوتا کیوں کہ سالہا سال (۲۰/۴۰ سال) سے قدیم ائمہ برقرار ہیں جو نہ خود اسے چھوڑنے تیار ہیں اور نہ مساجد کے متولیان انہیں علیٰحدہ کرنے تیار ہیں باوجودیکہ وہ نااہل ہیں۔ لیکن اگر وہ ازخود اسے چھوڑ دیں یا مسجد کے متولیان برضا وحکمت علیٰحدہ کریں تو دین کا بہت بڑا خلا دور ہوگا ان کی یہ قربانیاں اللہ کی رضا کا سبب بنیں گی کہ انہوں نے دین کے خاطر اہل ائمہ کو اپنے پر ترجیح دی گویا انہوں نے وقت کے تقاضہ کو اور دین کی اہم ضرورت کو سمجھا اور دین کا اہم قدم اٹھایا اللہ تعالیٰ ایسے اہم حوصلے اور جذبات عطا فرمائیں۔ لیکن اس وقت جب کہ ماہر اور اہل ائمہ میسر ہوں اور ان سے معاشرے میں کچھ انقلاب لانے کی توقع بھی ہو تب۔ لیکن یہ بھی بتادوں کہ اگر معاشرہ اور معاشرہ کے بااثر لوگ مثلاً متولیان، مسجد کے منتظمین اور دیگر علماء اہلیت کے حامل فعال ائمہ کو تعاون نہ کریں تو اہل ائمہ بھی کچھ نہیں کرسکیں گے کام کے لیے تمہارا تعاون ضروری ہے اگر تم نے اللہ کے واسطے ان کو صحیح صحیح سپورٹ کیا تو وہ معاشرے میں سدھار لاسکتے ہیں، اور یہ خیال تو ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ یہی بااثر لوگ اہل ائمہ برحق کی مخالفت بھی کرسکتے ہیں پھر ان کو اس منصب پر لانے کا کیا فائدہ؟ کیوں کہ یہ تو دین سے کھلی بغاوت ہے اور کھلی بے دینی ہے پھر تو انہیں قوم میں بااثر اور ذی وجاہت کا یہ منصب ناآفرین ہونا مبارک ہو پھر تو انہیں اپنے کمزور ومردہ ایمان پر نماز جنازہ پڑھنی چاہیے۔ آدمی کو دین کے لیے مددگار ہونا چاہیے اگر مددگار نہ بن سکے تو کم ازکم کنارہ پر ہوجانا چاہیے نہ کہ دین کو برباد کرنے میں مددگار ہونا چاہیے۔ (وتعاونوا علی البر۔۔۔۔)

کرر ہے ہیں کہ آپ خود صرف اپنے لیے نہیں بل کہ قوم کے لیے ہیں وہاں ہم متولیان مساجد کی بھی یہ تشکیل کرر ہے ہیں کہ امام کو معاش کی فکر سے آزاد بنانا بھی آپ کی ذمے داری ہے اس مختصر سے جملے میں ہم نے بہت کچھ کہہ دیا ہے جس میں فقہاء کرام کے اس قول کی بھی ترجمانی شامل ہے وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنی ذات کو قوم کے لیے سپرد کردے مثلاً امامت کرے تو اس کا خرچ اس قوم پر واجب ہے۔صرف معمولی تنخواہ دے کر اس فریضہ سے اپنے کو بچایا نہیں جاسکتا ۔۔۔اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ جب تمہارا امام لوگوں کی اصلاح کے لیے کوئی مناسب قدم اٹھائے تو تم پر بھی لازم ہے کہ ہر سچی بات میں تم اس کا ساتھ دو اور قوم میں سے کوئی شخص ایسے برحق امام کی مخالفت کرے تو تم سب مل کر اس مخالفت کرنے والے کو دبا دو اور اس کو اس سے روکو، حتی الامکان سمجھانے سے کام لو اگر وہ اپنی ضد پر رہے اور نہ مانے تو تم کسی قسم کی پرواہ نہ کرو کیوں کہ متبع سنت وشریعت نمازیوں کی تعداد کی کمی بہتر ہے بمقابل فتنہ پسند نمازیوں کی کثرت سے۔یہی بات حضرت مفتی احمد بیمات صاحب بھی تحریر فرماتے ہیں دیکھیے۔(ایضا ۱۴۳، ۱۴۴)۔

نوٹ : نہج الائمہ فی اصلاح الامہ ان پانچ حصوں میں مکمل ہوگئی۔بحمد اللہ تعالیٰ

ہم نے ائمہ مساجد کی ایک مستقل تنظیم (تنظیم برائے تمام ائمہ مساجد گجرات) بنانے کی بھی پوری کوشش کی ہے۔جس کے لئے A/4 سائز کے دس صفحات کمپوز کرا کر پورے گجرات کے تمام مہتمم حضرات اور مشائخ حدیث کو پیش بھی کیے، لیکن بدقسمتی سے کوئی اس کی تولیت وصدارت کے لیے تیار نہیں ہوا، حالاں کہ ہم نے (۱) تنظیم بنانے کی ضرورت واہمیت (۲) تنظیم کے مقاصد (۳) تنظیم کا طریقہ کار سب تحریر کیا ہے۔

لہٰذا کوئی اہل اور مخلص عالم اس کا بیڑہ اٹھا کر کام کرے تو دین کا بہت بڑا کام ہو۔کوئی ان صفحات کو طلب کرنا چاہے فون سے رابطہ کرلے۔

انتباہ انتباہ انتباہ

(۱) خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی شخص ولی تو بن سکتا ہے مگر نبی ورسول ہرگز نہیں۔

(۲) مقتدیوں کو ذہن نشین کرادیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں افراط وتفریط راہِ حق اور صراطِ مستقیم سے انحراف ہے۔

(۳) گناہوں کے کاموں کو گناہ اور حرام سمجھ کر ''بغلبۂ شہوت وغیرہ'' کرنے والا'' فاسق کہلائے گا، کافرنہیں'' ہاں اگر ان کو حلال یا حقیر سمجھ کر کرے تو وہ ''کافر'' کہلائے گا۔

(۴) خلاف شرع زندگی بسر کرنے والے سے خلاف عادت کوئی معاملہ ظاہر ہو تو اس کو نہ ولی کہیں گے نہ اس معاملہ کو کرامت۔ اس کو یا تو جادو، نظر بندی یا ہاتھ چالاکی جیسی چیز کہیں گے۔

(۵) گنہگار یا ڈاڑھی منڈانے والا اگر کوئی خاص کرتب دکھائے۔ مثلاً آگ پر چلے، ہوا میں اُڑے، بیماروں کو اچھا کردے اور فقیروں کو دولت عطا کرے تو یہ استدراج کہلائے گا۔

(۶) کسی فاسق وفاجر فقیر، مخصوص باپو یا سادھو سے کوئی خلاف عادت معاملہ ظاہر ہوتا دیکھیں تو ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اللہ کے یہاں محبوب ہے۔ (ماخوذ از عصری تعلیم اصول اور ضابطے مفتی احمد بن ابراہیم بیات)

الف۔ ائمہ اصولوں پر خود قائم وثابت رہیں پھر لوگوں سے ان کی تشکیل کریں۔

ب۔ کسی بھی غلطی وکوتاہی کا تدارک آسان بنائیں، اس کو اس کے حجم سے بڑھ کر حیثیت نہ دیں۔

ج۔ عبادت برائے زیادتی معرفت ہو اور زیادتی معرفت برائے زیادتی عبادت وطاعت ہو۔